

مرزا دبیر نے اس دور کی روایت کے مطابق فارسی زبان میں بھی اپنی طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ جس پر بہت کم ناقدین ادب کی نظریں پڑسکی ہیں۔ راقم الحروف کو یہ فخر ہے کہ اس کے شاگرد یاسر عباس سلمہ نے مرزا دبیر جیسے عظیم شاعر و مفکر کے فارسی کلام کی جستجو کر کے اس کا اعلی ناقدانہ جائزہ لے کر کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک نہایت مثبت و عالمانہ قدم ہے۔ یہ کتاب مرزا دبیر کی فارسی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے فارسی ادب میں مرزا دبیر کے مقام کی متلاشی رہے گی۔ لائق مبارک باد ہیں یاسر عباس کہ جنہوں نے اردو کے عظیم ترین شاعر کے فارسی کلام پر مقالہ تحریر کر کے فارسی شاعری کی تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے روشن مستقبل کی آرزو کرتے ہوئے ان سے اسی طرح کے اچھوتے مضامین پر کام کرنے کی امید کرتا ہوں۔ یہ جادہ ہے منزل نہیں ہے۔

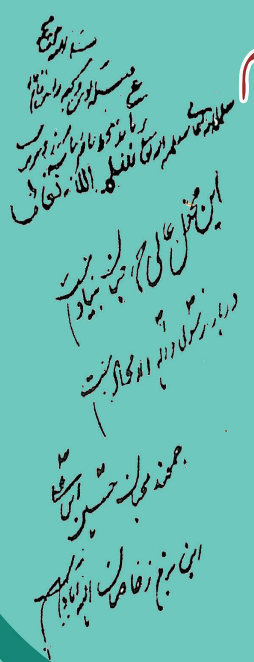
عراق رضا زیدی

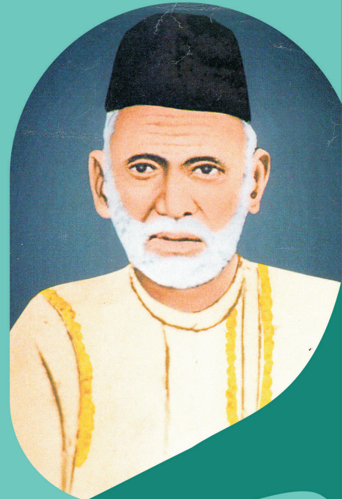
صدر و پروفیسر، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

iraq_raza@yahoo.co.in

مرزا دبیر کی فارسی شاعری

نقد و تفہیم





ڈاکٹر یاسر عباس

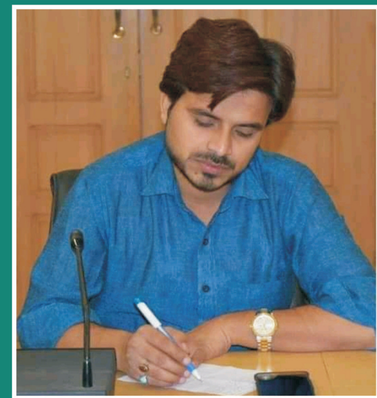
مرزا دبیر کی فارسی شاعری: نقد و تفہیم

ڈاکٹر یاسر عباس

Mirza Dabir ki Farsi Shayeri: Naqd-o-Tafheem

By

Dr. Yasir Abbas



M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 81-941909-8-3

9788194190981



عزیزی ڈاکٹر یاسر عباس نے میرزا دبیر کی فارسی شاعری کو اپنے پی ایچ ڈی مقالے کا موضوع بنایا، جو عام طور سے دبیر کا فراموش شدہ کارنامہ ہے۔ دبیر نے تقریباً تمام اصناف شعر فارسی میں طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقی ہمہ دانی کے جوہر بکھیرے۔ البتہ ان تمام گوہرانِ سخن پر آب ِ دُرِ ذکرِ شہدائے کربلا کا ہے، اور مدحِ اہلِ بیت کا ریحانِ روح افزا ہے۔ ڈاکٹر یاسر عباس نے نہ صرف کلام دبیر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے بلکہ مختلف اصناف سخن کے فنی و تاریخی پہلوؤں کے حوالے سے بحث کے ساتھ ساتھ محاسن و مطالب کلام کا تحلیل و تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے موصوف تحسین و تشویق کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ ادبی و علمی حلقوں میں اس کوشش کی پذیرائی ہوگی۔

اخلاق احمد آہن

پروفیسر، شعبۂ فارسی،

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

akhlaq.ahan@gmail.com

مرزا دبیر کی فارسی شاعری
نقد و تفہیم

ڈاکٹر یاسر عباس

کتاب : مرزا دبیر کی فارسی شاعری: نقد و تفہیم
مصنف : ڈاکٹر یاسر عباس
تعداد : 400
مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز
ملنے کے پتے : ☆ شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
☆ امامیہ ایجوکیشنل سوسائٹی، شیعہ نگر رجیٹی، ضلع ہاپوڑ، یوپی
☆ ادارۂ بوستان قلم، قصبہ سیتھل، ضلع بریلی، یوپی

Mirza Dabir ki Farsi Shayeri: Naqd-o-Tafheem

BY

Dr. Yasir Abbas

Mob.: 09015115337 Email: yasirabbasgazi.yr@gmail.com

ISBN: 978-81-941909-8-1

First Edition :2019

Price: ` **250/-**

Library Edition: ` 375/-

''یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
اس کے مشمولات سے اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں''۔

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910, 8368305471 (Whatsapp)
E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

اپنے مہربان والدین

اور

مشفق اساتذہ کرام کے نام

مشمولات

مقدمہ

دنیا کی تمام زبانوں کا اپنا اپنا جداگانہ مقام ہے ادب، روایات اور تاریخی پس منظر ہے۔ لیکن قرآن کے علاوہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب کا دنیا کی کسی دوسری زبان میں اتنا ترجمہ نہیں کیا گیا جتنا فارسی ادب کے شہ پاروں کا کیا گیا اور اس کی خاص وجہ اس کا اخلاقی وعرفانی پہلو ہے۔تصوف کی داغ بیل عرب میں ضرور پڑی لیکن اس کے ادب کی پیشرفت فارسی زبان میں ہوئی۔ جہاں جہاں بھی یہ صوفیاے کرام خدمت دین کے لئے گئے وہاں انہوں نے اپنی تہذیب وتمدن کا اثر ضرور ڈالا۔فارسی زبان میں جو ادب وجود میں آیا اس کی نظیر دنیا کی دوسری زبانوں میں بہت کم ملتی ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ترقی وترویج غزنوی دور کے ساتھ شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں پنجاب اور ملتان کو مرکزیت حاصل رہی۔ سکندر لودی نے فارسی کو سرکاری و درباری زبان کا درجہ دیا تو اس کی ترقی میں چار چاند لگنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ لودیوں کو شکست دینے کے بعد جب مغلوں نے ہندوستان پر اقتدار حاصل کیا تو یہ دور فارسی زبان وادب کا ''عہد زرین'' کہلایا۔مغل حکومت کی بنیاد ۱۵۲۶ء میں ظہیر الدین بابر نے ڈالی۔ بابر کے بعد آنے والے مغلیہ سلاطین نے جہاں اپنی حکومت کے استحکام کے لئے جد جہد کی وہیں فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کا بھرپور خیال رکھا۔

فارسی زبان کی سب سے بڑی خاصیت اس کی لطافت وشیرینی ہے اس میں ایک مٹھاس ہے۔ ہند و ایرانی روابط کو مضبوط کرنے میں فارسی زبان کا اہم کردار رہا ہے کیونکہ فارسی ادب نے ہندوستانی ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا۔مغلیہ دور ترقی و پیشرفت کے لحاظ سے فارسی زبان و

ادب کا زریں دور کہلاتا ہے اور اس کی وجہ فارسی زبان کا درباری زبان قرار پانا ہے۔ چونکہ فارسی کو درباری زبان کا درجہ ملنے کے بعد عوام وخواص سب پر خود ہی لازمی ہو گیا کہ وہ فارسی زبان سیکھیں اس لئے کہ خواص کو اگر بادشاہ کی قربت چاہیے تو اس کو وہی زبان بولنی ہوگی جو بادشاہ کو پسند ہو۔ مغلیہ حکومت میں علماء، فضلاء، شعراء وادباء کی حوصلہ افزائی کی گئی انہیں انعام و اکرام سے نوازا گیا اس طرح اس دور میں فارسی زبان نے خوب ترقی کی۔ اسی ترقی و پیشرفت کی بنا پر ہندوستان فارسی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ مغلیہ سلاطین و امراء کی داد و دہش کا شہرہ سن کر علماء، فضلاء، شعراء وادباء ایران سے ہجرت کر کے وارد ہندوستان ہوئے اور فارسی زبان و ادب کی خدمت کی بدولت اعلی مناصب پر فائز ہوئے اور فارسی زبان و ادب کی ترقی کا باعث بنے۔

مغلیہ سلطنت جب تک محکم و مستحکم رہی فارسی بھی بام عروج پر رہی لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب بھی رو بہ زوال ہونے لگا اور فارسی کی جگہ اردو زبان رواج پانے لگی۔ دہلی حکومت متزلزل ہوئی تو ادباء وشعراء دہلی کو چھوڑ کر مختلف نئی ریاستوں اودھ، حیدر آباد، رامپور وغیرہ کی جانب ہجرت کرنے لگے۔ دہلی سے ہجرت کر کے بیشتر اہل علم لکھنو پہنچے اور وہاں نوابین اودھ کی سرپرستی میں ادب کو نئی زندگی عطا کی۔ ۱۹ویں صدی میں اردو اس قدر عام ہو چکی تھی کہ بڑے بڑے شعراء اپنی موزوں طبیعت کی جولانیاں اردو زبان میں دکھانے لگے تھے لیکن مراسلات کے لئے فارسی زبان کا استعمال قدرے کم ہونے کے باوجود جاری وساری تھا۔ مرزا دبیر بھی انہیں شعراء میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی طبیعت کی موزونیت کو اردو زبان میں آزمایا لیکن چونکہ فارسی مرزا دبیر کی مادری زبان تھی اور فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی لہذا فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی۔

زبان کی بقاو جاودانی اس کے ادب سے جانچی پرکھی جاتی ہے جس زبان کا ادب جتنا ضخیم ہے اس کی اتنی ہی اہمیت ہے۔ لیکن جیسا کہ مثل ہے" **هر کمالی را زوالی است**" ہر کمال

کو زوال ہے۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا مغلیہ دور ''عہد زریں'' تھا جیسے جیسے مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوتی گئی ویسے ہی ویسے فارسی کی مقبولیت بھی کم ہونے لگی اور اس کی جگہ ایک نئی زبان اردو نے حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ ماہرین فن فارسی بھی اردو زبان میں ہی طبع آزمائی کرنے لگے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے نتیجے میں دہلی جو دارالحکومت تھی اپنی آب و تاب کھونے لگی اور بڑے بڑے صاحبان فن ہجرت کر کے دوسرے مقامات کی طرف گامزن ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ نے دہلی ترک کر کے لکھنو کو اپنا مستقر قرار دیا۔ لکھنو کہ جہاں نوابین اودھ نے اپنی تدابیر سے شہر کو نظر بد سے بچائے رکھا تھا اور اس عالم میں کہ جب دہلی میں افراتفری تھی لکھنو میں مشاعرے وجشن منعقد کئے جارہے تھے جس میں شعراء کے علاوہ نوابین بھی داد سخن دے رہے تھے۔ شعراء وادباء کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کوئی ان کی تخلیقات کو سراہے ان کو داد وتحسین سے نوازے اور یہ تمام ضروریات لکھنو میں بخوبی پوری ہو رہی تھیں۔ لکھنو میں سخن گوئی وسخن فہمی کا چرچا عام تھا ہر دوسرا شخص خود کو شاعر گردانتا تھا۔ ایسے ماحول میں اپنی الگ پہچان قائم کرنا، خود کو منوانا، اور شہرت حاصل کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جب سب ایک ہی راستہ پر چل رہے ہوں اور کوئی ایک الگ راستے پر چلنے لگے تو ہر کوئی اس کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ جس کی مثال مرزا دبیر کی مشکل اور نئی ڈگر کا ہونا ہے۔

مرزا دبیر ایک مذہبی، پارسا شاعر تھے اور اردو زبان میں مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچانے والے ایک ایسے مشہور ومعروف شاعر ہیں جنھوں نے فارسی زبان کی خدمت بھی نہایت سلیقے سے انجام دی۔ ان کا زمانہ انگریزوں کی بالادستی اور نوابین اودھ کی کم اختیاری کا زمانہ تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فارسی زبان وادب کا چراغ مدھم ہو رہا تھا اور اردو زبان ادبی حلقوں میں رواج پا رہی تھی۔

اردو زبان کی ابتدا کے ساتھ ساتھ اس کے دو بڑے دبستان وجود میں آئے پہلا دبستان دہلی اور دوسرا لکھنو۔ دہلی کی تاراجی اور ناآسودہ حالات کی بنا پر دہلی سے ہجرت کر کے لکھنو

پہنچے ادباء وشعراء نے لکھنوی دبستان کو پرنور ومقبول عام کر دیا۔لکھنو شہرہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا ورثہ دار، ہندوستانی ادب و روایات کا پاسدار ہے۔ ۱۹ویں صدی میں لکھنو کی فضا ادب کے لئے نہایت سودمند تھی چونکہ نوابین کی شکل میں ادباء وشعراء کونوازنے والی شخصیات موجود تھیں۔اس دور میں میر تقی میؔر، ناسؔخ، آتؔش، ضاحؔک، دلگیؔر وضمیؔر جیسے شعراء دادِسخن دے رہے تھے۔ایسے عالم میں ایک بچے نے دہلی کی گلیوں میں سے مشہور بلیماران میں ۱۸۰۲ء میں جہان فانی میں قدم رکھا لیکن حالات کی نا مساعدگی نے اسے دہلی سے لکھنو پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر اس موزوں طبیعت شخص کے ذہن رسا پر لکھنو کے ادبی ماحول نے ایسا اثر ڈالا کہ ۱۲ رسال کی عمر میں جبکہ بچے کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں دنیاو مافیہا سے بےخبر ہوتے ہیں اس سن میں ادب کے نوک و پلک سنوارنے شروع کر دئے اوراس وقت کے مقبول ومعروف استاد میر ضمیؔر کے سامنے جب والد نے اپنے اس نونہال کو پیش کر کے اپنی شاگردی میں لینے کی گزارش کی تو استاد نے بھی اپنے طور آزمائش کی غرض سے کچھ سنانے کو کہا۔ میر ضمیر کے حکم کے مطابق مرزا دبیؔر نے برجستہ شعر سنائے جسے سن کر حاضرین واہ واہ کئے بغیر نہ رہ سکے۔

مرزا دبیؔر نے علوم مروجہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔عربی و فارسی زبان پر مکمل دسترس پیدا کی اور اس کا ثبوت مرزا صاحب نے اپنی تخلیقات میں جا بجا فراہم کیا ہے۔ تاریخ گوئی جیسے مشکل ترین صنف سخن میں آپ نے صرف فارسی زبان سے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ عربی زبان میں بھی تاریخیں نظم کی ہیں قرآن کریم کی آیات سے تاریخ کا استنباط کیا ہے۔مرزا دبیؔر کا مزاج وقت کے ساتھ ساتھ مذہبی ہوتا گیا اس کا ثبوت ان کی شاعرانہ پیشرفت سے فراہم ہوتا ہے ۔ کیونکہ مرزا دبیؔر نے شروع میں غزلیں موزوں کیں اور اس قدر کیں کہ تین دیوان مرتب کر ڈالے لیکن جب ان کی ایک غزل کو رقاصہ نے اپنے ہنر کے لئے استعمال کیا تو آپ نے غزل گوئی سے توبہ کر لی یہاں تک کہ اپنے غزلیاتی دوانین کو نذر آتش کر دیا۔

مرزا دبیؔر نے جب ہوش سنبھالا تو انہوں نے لکھنو میں شعر وشاعری کا بازار گرم دیکھا

اس وقت دنیاوی موضوعات پر زیادہ طبع آزمائی کی جارہی تھی یعنی غزل کا عام رواج تھا۔ کچھ ہی شعراء تھے جو مرثیہ گوئی میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ ان میں خود دبیرؔ کے استاد میر ضمیرؔ اور میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ سرفہرست تھے۔ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں فارسی ادب کو عام رواج نہ رہا لیکن اکثر شرفاء و علماء اسی زبان کا استعمال کر رہے تھے۔ ۱۹ویں صدی میں ہی بہت سے ایسے شعراء آسمان ادب میں رونما ہوئے جو صرف اردو ہی نہیں بلکہ فارسی زبان میں بھی باقاعدہ شاعری کرتے تھے جن میں میر تقی میرؔ، میر دردؔ، انشاء اللہ خاں انشاءؔ، مصحفی، مومن خاں مومنؔ اور مرزا غالبؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں انہیں شعراء میں ایک مرزا سلامت علی دبیرؔ کا نام نامی بھی ہے۔ جنہیں اردو ادب سے ذرا سی بھی رغبت رکھنے والا طالب علم بخوبی جانتا اور پہچانتا ہے لیکن ان کے فارسی زبان کے شاہکاروں سے نا آشنا ہے۔

مرزا دبیرؔ نے زمانہ کی روش کے برخلاف دنیاوی کلام سے اجتناب کیا اور صرف خدا، رسول اور آل رسول علیہم السلام کی مدح و ثنا کو اپنا موضوع سخن قرار دیتے ہوئے اردو و فارسی کی مروجہ تمام اصناف سخن قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ، نوحہ، ترکیب بند، ترجیع بند، تضمین وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ یہاں تک کہ غزل کی ہیئت میں بھی اسی مذہبی شاعری کو موضوع سخن بناتے ہوئے ''سلام'' کو معراج عطا کی۔ مرزا دبیرؔ نے اپنے کلام کے ذریعہ فارسی زبان و ادب کی کافی خدمت کی ہے لیکن ان کے کلام تک رسائی نہ ہونے کی بنا پر ان کے فارسی کلام کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو پائی جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ کتاب فارسی ادب میں دبیرؔ کا مقام متعین کرنے اور فارسی کے عام قارئین تک ان کے افکار کو پہنچانے کی ایک ناقدانہ کوشش ہے۔

مرزا دبیرؔ کی شخصیت اردو دنیا میں تعارف کی محتاج نہیں ہے چونکہ اردو مرثیے کو جو مقام مرزا دبیرؔ و میر انیس نے دلایا اس کا معترف ہر ادب نواز شخص ہے۔ چونکہ اس وقت مرثیہ خوانی کا یہ طریقہ تھا کہ ذاکر مرثیے سے پہلے ایک دو رباعی اور سلام پیش کرتا تھا اس کے بعد مرثیہ پڑھتا تھا اس لحاظ سے مرزا صاحب نے بہت رباعیات نظم کیں جن کی تعداد ڈاکٹر تقی عابدی

نے اپنی تالیف ''مجموعہ رباعیات دبیرؔ'' میں ۱۳۳۹ ذکر کی ہے۔ جس میں سے ۳۵ رباعی فارسی کی تحریر کی ہیں حالانکہ جب ان فارسی رباعیات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ صرف ۳۰ رباعیات ہی رباعی کے معیار کو پورا کرتی ہیں باقی پانچ قطعات ہیں جنہیں ان کی ظاہری ہیئت دیکھ کر ڈاکٹر عابدی نے رباعیات میں شامل کر دیا۔ اس پر مکمل بحث ''رباعیات'' کے ذیل میں پیش کی گئی ہے۔

جو شاعر رباعی جیسی مشکل صنف پر اس قدر طبع آزمائی کرے اس کی دیگر شاعرانہ تخلیقات جو رباعی کے مقابلے قدرے آسان متصور کی جاتی ہیں کس قدر ہوں گی۔ مرثیے کی تعداد محققین نے الگ الگ بیان کی ہے۔

مرزا دبیرؔ کے پاس اکثر لوگ امرا، نوابین اور بیگمات کی خدمت میں سفارش کے لئے آتے تھے اور اگر کسی کو مرزا صاحب کی سفارش سے فائدہ ہوتا تو سفارش سے کبھی گریز نہیں فرمایا یا تو خود ساتھ چلے جاتے یا کبھی کوئی رقعہ یا نامہ تحریر فرما دیتے۔ مرزا دبیرؔ کے اپنے معاصرین سے نہایت دوستانہ مراسم تھے وہ اپنے سامنے کسی کی برائی نہ کرتے اور نہ سنتے تھے۔ میر انیسؔ جنہیں محققین نے مرزا دبیرؔ کا حریف بنا دیا ہے دونوں میں اس قدر اخوت تھی کہ میر انیسؔ کی وفات سے مرزا دبیرؔ کو بہت صدمہ پہنچا یہی وجہ ہے کہ میر انیس کے انتقال کے بعد مرزا صاحب بمشکل تین مہینے زندہ رہے۔

مرزا دبیرؔ صرف ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ ان میں صلہ رحمی، کنبہ پروری، اخلاق و مروت جیسی تمام صفات حسنہ بدرجہ اتم موجود تھیں۔

مرزا دبیرؔ نے مذہبی شاعر ہونے کی بنا پر آیات و احادیث سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ لہذا ان موضوعات کے تنوع کو دیکھتے ہوئے کلام میں بیان کی گئی تلمیحات کو تاریخی اسناد کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رباعیات و تاریخی قطعات کے علاوہ مرزا دبیرؔ نے صفوی دور کے معروف شاعر ملا حسنؔ کاشی آملی متوفی ۷۲۶ھ کے مشہور زمانہ 'ہفت بند'' پر تضمین موزوں کی ہے۔ اس ہفت بند کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صفوی عہد کے

معروف مرثیہ گو شاعر محتشم کاشانی اور اس کے علاوہ دیگر شعراء نے مثلاً رفیعی، سالک قزوینی اور فیاض لاہجی وغیرہ نے ملاحسن کے اتباع میں ہفت بند کہے۔ ہندوستان میں مولوی سید نثار حسین عظیم آبادی، راجہ الفت رائے الفت اور رتن سنگھ زخمی اور مرزا دبیر نے ہفت بند پر تضمینیں کہی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفت بند کی ہندوستان میں بھی شہرت کم نہیں تھی۔ لیکن مرزا دبیر کے علاوہ دیگر شعرا کی تضمینیں مکمل طور پر دستیاب نہیں ہے۔ مرزا دبیر کی زندگی ہی میں ان کی نظم کردہ تضمین بعنوان ''شمس المشرقین''، مطبع یوسفی دہلی سے ۱۲۸۰ھ میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی تھی۔ جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور کے شعبہ خاص میں موجود ہے۔ اس تضمین میں ۱۷۹ بند ہیں جس کا اصل موضوع مدح حضرت علی علیہ السلام ہے جس کے لئے مرزا دبیر نے قرآنی آیات کے علاوہ احادیث رسول و تاریخی روایات سے استفادہ کیا ہے۔

مرزا دبیر کا ایک ترجیع بند درحقیقت فارسی مرثیہ ہے۔ فارسی زبان میں مرثیے کا کوئی مخصوص قالب یا مخصوص ہیئت نہیں ہے اردو زبان میں بھی مرثیے کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں تھی۔ مرثیے کی موجودہ و مروجہ ہیئت مرزا محمد رفیع سودا کی دین ہے جسے میر ضمیر و میر خلیق نے آگے بڑھایا اور ان دونوں کے بعد ان کے شاگردان مرزا دبیر و میر انیس نے بام عروج تک پہنچایا۔ اس باب میں محتشم کاشانی و مقبل اصفہانی جیسے فارسی کے مشہور و معروف شاعروں کے مرثیوں سے چند بند مثال میں پیش کر کے فارسی مرثیہ پر بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے لائق حمد و ثنا ذات احدیت اللہ تبارک و تعالی کا شکر ادا کرتا ہوں جس کا شکر ادا کرنا انسان کے بس کے باہر ہے کہ اسی ذات اقدس کی رحمت و توفیقات کے طفیل اس منزل تک پہنچا۔ خدا کے بعد اس کے محبوب رسولؐ اور ان کی آل پاک پر درود و سلام۔ اپنے والد محترم ماسٹر سجاد حسین اور والدہ گرامی کا شکرگزار ہوں جن کی محبت و مروت نے اس لائق بنایا اور ہمیشہ ہر ممکنہ تعاون کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی۔ ساتھ ہی ساتھ میرے بڑے تایا محترم جناب مولانا ناصر حسین صاحب کا بھی شکریہ جو اپنی نابینائی کے باجود ہم جیسے متعدد بچوں، نوجوانوں و جوانوں کو ابتدائی دینوی و دنیوی تعلیم کے ساتھ اپنے

گرانقدر تجربات سے باہوش و باشعور بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور آپ کا قائم کردہ تعلیمی ادارہ ''امامیہ ایجوکیشنل سوسائٹی'' اپنے پچاس سال مکمل کرنے کے بے حد قریب ہے ان کی تمام تر نصیحتیں میرے لئے مشعل راہ ہیں۔ بعدہٗ اپنے شفیق استاد محترم پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بیحد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے ہر گام پر اپنے مفید مشوروں سے میری رہنمائی کی اور اپنے قیمتی اوقات سے میرے لئے فرصت نکال کر ہر ممکن معاونت کی۔ ساتھ ہی شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دیگر شفیق اساتذہ پروفیسر عبد الحلیم اخگر، ڈاکٹر سید کلیم اصغر اور شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریٹائرڈ پروفیسر سید عزیز الدین حسین ہمدانی کا بھی بیحد ممنون ہوں جنہوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا بھی بیحد ممنون ہوں جنہوں نے کتابوں کی فراہمی کے علاوہ اپنے مشورورں سے نوازا۔ میرے وہ تمام اساتذہ جو میری ابتدائی تعلیم سے لے کر میری پی ایچ ڈی تک مجھے قدم قدم پر راہنمائی فرماتے رہے اگر میں سب کے نام تحریر کروں تو ایک طویل فہرست مرتب ہو جائے گی لہذا معذرت کے ساتھ ان سبھی معزز اساتیذ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

اس کتاب کی تکمیل میں اپنے دوست و احباب کا بیحد ممنون ہوں۔ خصوصا محمد افضل زیدی کا جنہوں نے کتاب کی کمپوزنگ میں میری معاونت فرمائی۔ اپنے استاد محترم پروفیسر عراق رضا زیدی کی شریک حیات کا شکریہ ادا کرنا اخلاقی و ادبی طور پر واجب سمجھتا ہوں جن سے وقتاً فوقتاً مفید مشورے اور پروف ریڈنگ میں مدد ملتی رہی۔ بڑی نا اصافی ہو گی اگر میں اپنے برادران و خواہران کے ساتھ ساتھ اپنی شریک حیات کا شکریہ ادا نہ کروں کہ جنہوں نے میری عدیم الفرصتی کا مجھ سے کبھی کوئی شکوہ و شکایت نہیں کیا اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

خدا کے نام سے کرتا ہوں فکر کا آغاز　　　وہی ہے اعلم و اعظم اسی سے راز و نیاز

"ایک تابدار کاوش"

یزدان کائنات نے فارسی زبان و ادب کو اسلامی فکری اساس سے مالا مال کر کے اخلاقی ادب کی فراوانی کی بنا پر دنیا کی تمام زبانوں پر فوقیت عطا کی۔ صرف عربی زبان کو کلام خدا، احادیث رسول خداؐ اور بیانات آل رسولؐ کی حد تک برتری بخشی۔ ہندوستان کی ہر دلعزیز زبان اردو کو فارسی زبان کا قائم مقام سمجھا گیا۔ جس کا صرف رثائی ادب فارسی رثائی ادب سے اعلی رہا۔ جس کا سہرا میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کے سر رہا۔ انیسیے شبلی نعمانی کی ہزار کوششوں کے باوجود آج بھی دبیر کا مقام کسی طور انیس سے کم نہ ہو سکا۔ مرزا دبیر نے اس دور کی روایت کے مطابق فارسی زبان میں بھی اپنی طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ جس پر بہت کم ناقدین ادب کی نظریں پڑ سکی ہیں۔ راقم الحروف کو یہ فخر ہے کہ اس کے شاگرد یاسر عباس سلمہ نے مرزا دبیر جیسے عظیم شاعر و مفکر کے فارسی کلام کی جستجو کر کے اس کا اعلی ناقدانہ جائزہ لے کر کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک نہایت مثبت و عالمانہ قدم ہے۔

کہتے ہیں کہ مرزا دبیر نے اردو ادب میں ہر شاعر سے زیادہ رباعیاں موزوں کی ہیں۔ فارسی میں بھی ان کی رباعیات کی خاص تعداد موجود ہے۔ رباعی موزوں کرنا ہی مشکل امر ہے پھر رباعیات کا ناقدانہ جائزہ لینے کے لئے عروض و بلاغت کی شناسائی کے ساتھ رباعی گوئی کی روایت پر بھی نظر ہونا لازمی ہے۔ یہ بحث اس کتاب میں موجود ہے۔ دبیر کی رباعی ہے:

صد چاک رسیده همچو گل برتنِ او
آغشته بخون چون غنچه پیرهن او
پیغام ده شهادتش فصلِ بهار
بشگفته ز زخم جا بجا گلشن او

یاسر نے اس رباعی پر ناقدانہ بحث اس طرح کی ہے۔

''مذکورہ رباعی میں مرزا دبیرؔ نے تشبیہات کا بہترین استعمال کیا ہے اور درد و غم کو بھی الگ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے گویا مصائب سے فضائل کا گوشہ نکالا ہے۔ امام حسینؑ کے جسم اطہر پر جو زخم تھے انہیں پھول کی پتیوں سے تشبیہ دی ہے اور بہتے ہوئے خون کو پھول کا رنگ قرار دیا ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت کو فصل بہار سے تعبیر کیا ہے کیونکہ بہار جہاں جہاں تک جاتی ہے پھول کھلاتی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح شہادت حسینی بھی دین اسلام کے لئے بہار ہے کہ جہاں تک بھی شہادت حسینؑ کا پیغام پہنچا وہاں تک اسلام کو نئی زندگی ملتی چلی گئی''۔

رباعی کے بعد قطعات فارسی کی خوبیوں پر بحث کی گئی ہے جس کے زیر اثر قطعہ کی تاریخ و ہیئت پر نظر ڈالتے ہوئے مرزا دبیر کے قطعات کی اہمیت وافکار کی بلندی کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ عید نوروز یعنی ۲۱ مارچ کی مناسبت سے کئی جغرافیائی سائنٹیفک اور تاریخ اسلام سے مختص کئی حقائق ایک قطعے میں موزوں کردئے گئے ہیں جس کے سمجھنے کے لیے تاریخ اسلام، تاریخ و حقیقت مذہب زردشت اور نظام سے واقف ہونا لازمی ہے۔ یاسر عباس نے ایسے قطعات کا خوب جائزہ قلمبند کیا ہے:

عیدِ نو روز عیدِ اکبر شد
جانشینِ رسولؐ حیدرؑ شد
عدل حیدرؑ به بین که از امروز
درجهاں روز و شب برابر شد

مرزا دبیرؔ نے اس قطعہ میں ایک نادر مضمون نظم کیا ہے یعنی حضرت علیؑ کو رسول اکرمؐ نے جب مولا بنایا تھا تو ۱۸/ذی الحجہ ہجری تاریخ ۲۱ مارچ شمسی تاریخ تھی۔ اور اس تاریخ ۲۱ مارچ کو عام طور پر دن اور رات برابر ہوتے ہیں یعنی ۱۲/۱۲ گھنٹے کے ہوتے ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے اسی دن کو

مولائے کائنات کی عدالت کی مثال قرار دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں عید نوروز سب سے بڑی عید ہو گئی۔ بڑی عید اس لئے ہوئی کیوں کہ علی مرتضیٰؑ جانشین مصطفیٰ ہو گئے۔ اب عدالت حیدری ملاحظہ کرو کہ علی کی نیابت کے اعلان کی خوشی میں دن اور رات دونوں برابر ہو گئے۔

صنف سخن تاریخ گوئی دراصل رباعی گوئی سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ جس میں علم ابجدی کے ساتھ علم ریاضی کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے یہاں اکثر علم نجوم کی ضرورت بھی پڑتی ہے مرزا دبیر نے تاریخ گوئی میں کمال دکھایا ہے۔ میر انیس کی مشہور زمانہ تاریخ وفات صنعت ''زبر و بینہ'' میں موزوں کی ہے تو ایک ایسی تاریخی نظم اس کتاب کی زینت ہے کہ جس کے ہر مصرعے سے سال تاریخ ۱۲۴۶ھ برآمد ہوتا ہے جس کا نتیجہ اس طرح برآمد کیا گیا ہے۔

''مذکورہ قطعہ میں مرزا دبیرؔ نے اپنی تاریخ گوئی میں مکمل مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک ہی قطعہ میں صوری تاریخ بھی نظم کی ہے مہملہ تاریخ بھی، فارسی تاریخ بھی نظم کی ہے اور قرآنی تاریخ بھی۔ جس سے مرزا صاحب کی فارسی و عربی دونوں زبانوں پر دسترس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے''۔

مرزا دبیر کا کلام تحریک کربلا کا عکاس ہے۔ جس میں تاریخ اسلام کی چیدہ چیدہ جھلکیاں بھی رونما ہوتی رہی ہیں۔ تحت اللفظ سے مشتق مجالس کے لیے مرثیہ کی ہراول صنف سخن رباعی ہے۔ کبھی کبھی قطعات بھی پڑھے جاتے ہیں۔ عشرہ محرم سے ۸ ربیع الاول تک کربلائی مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بعد ازاں شخصی سوم، چہلم یا برسی پر ہونے والی مجالس میں مرحوم کی تاریخ وفات بھی موزوں کی جاتی ہے۔ مرثیے کے بعد نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ مرزا دبیر نے نوحوں پر بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ دراصل اردو مرثیے کی تاریخ نوحوں کی روایت سے ہی شروع ہوتی ہے یہاں ایک نوحے کے مطلع پر ناقدانہ عمل قابل دید ہے:

''کسی بھی کلام کی مقبولیت میں اس کا مطلع سب سے زیادہ دخیل مانا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر مطلع ہی بے جان ہو تو سامعین کی توجہ مکمل طور پر نہیں

ہو پاتی اور اگر مطلع جاندار ہو تو سامعین شروع ہی سے جڑے رہتے ہیں۔خصوصاً نوحے کا مطلع جو ہر شعر پڑھنے کے بعد اکثر دہرایا جاتا ہے اب اس نوحے کا مطلع دیکھئے۔مرزا دبیر نے جو حسن تعلیل اس مطلع میں بیان کی ہے وہ قابل تقلید ہے۔آسمانی شفق ایک قدرتی معاملہ ہے۔ کیونکہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں آسمان کی جانب بلند ہو جاتی ہیں جس وجہ سے آسمان کا رنگ سرخ نظر آتا ہے ۔لیکن مرزا دبیر نے آسمان کی اس سرخی کی الگ ہی علت بیان فرمائی۔آپ فرماتے ہیں زینب مضطر کے حال پر آسمان بھی بے حال ہے یعنی آسمان زینب کی حالت پر گریہ کناں ہے جس کی وجہ سے اس میں سرخی نظر آ رہی ہے ۔اس سرخی کا سبب غم حسینؑ میں خون کے آنسوؤں کا بہانا ہے''۔

مقالے کا اصل جز فارسی مرثیہ نگاری ہے۔کیوں کہ مرزا دبیر اردو مرثیہ نگاری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ فارسی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ملاحسن کاشی کا''ہفت بند'' جس پر اکثر شعرا نے تضمینیں کہی ہیں اور محتشم کاشانی کا''دوازدہ بند'' ہے جس کا جواب آج تک نہ مل سکا۔اس کے علاوہ فارسی مرثیے کی تاریخ بہت زیادہ محکم نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ مرزا دبیر کے فارسی مرثیے بھی ان دو مرثیوں کے بعد اپنا جواب آپ ہیں۔دبیر اردو زبان میں مسدس کی شکل میں مرثیہ کہنے کے عادی ہیں لہذا انہوں نے فارسی میں بھی اسی ہیئت کو نبھانے کی کوشش کی ہے اور چار مصرعوں پر ایک ترجیعی بیت کے ذریعے مسدس بنا کر ترجیع بند میں مرثیے موزوں کیے ہیں۔ اولین تین ترجیع بند مراثی کے مندرجہ بیت ہیں جن پر مراثی کا دارومدار ہے۔ان میں ایک بند تو اکثر اماباڑوں کی زینت رہا ہے:

بی ادب پا منه اینجا که عجب درگاهی است
سجده گاه ملک و روضه شهنشاهی است

دوسرے مرثیے کے ۴۷ بند ہیں جس کی بیت ہے۔

دُریگانۂ دریای مجمع البحرین

بخون طپیدۂ کرب و بلا امامِ حسینؑ

اور آخری مرثیے (ترجیع بند) میں ۲۳ بند ہیں جس کی بیت ہے:

بلند مرتبہ شاھی ز صدر زین افتاد

اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد

اس طرح یہ کتاب مرزا دبیر کی فارسی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے فارسی ادب میں مرزا دبیر کے مقام کی متلاشی رہے گی۔ لائق مبارک باد ہیں یاسر عباس کہ جنہوں نے اردو کے عظیم ترین شاعر کے فارسی کلام پر مقالہ تحریر کر کے فارسی شاعری کی تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے روشن مستقبل کی آرزو کرتے ہوئے ان سے اسی طرح کے اچھوتے مضامین پر کام کرنے کی امید کرتا ہوں۔

یہ جادہ ہے منزل نہیں ہے۔

ڈاکٹر عراق رضا زیدی

صدر و پروفیسر، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

iraq_raza@yahoo.co.in

حرف گفتنی

جدید ہند۔فارسی تہذیبی روایات تقریباً ہزار سال اور برصغیر کے مختلف زبانوں اور ان کے ادب، رسوم و رواج اور افکار و عقاید پر محیط ہے۔ اس پر فارسی تہذیبی عناصر کے گہرے اثرات ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان عناصر کے بغیر ہماری تہذیبی شناخت اور بقا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو بے جا نہ ہوگا۔ آج ہم جن دبستان ادب کو جانتے ہیں، ان میں بطور خاص دبستان دہلی و لکھنؤ کا ذکر آتا ہے، وہ تاریخی طور پر اسی فارسی ادبی دبستان کے وارث ہیں۔ خاص طور دبستان لکھنؤ کئی اعتبار سے ہند ایرانی ثقافتوں کا بڑا خوبصورت سنگم بن کر ابھرا۔ جس زمانے میں لکھنو کی تہذیبی آبیاری ہوئی ہے، وہ حائلی دور ہے۔ لیکن جس حسن و خوبی سے اس دیار کے ارباب ادب و سیاست نے اس کی سرپرستی کی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس دور کے ادبی رویوں کا سب سے درخشاں پہلو عاشورائی یا کربلائی مضامین اور مطالب کا شعر و سخن کا حصہ بنانا ہے، اور اس ادبی و فکری رجحان کے سب سے نمائندہ چہرے میر انیس و میرزا دبیر ہوئے۔ دونوں معاصر ہوتے ہوئے بھی اپنے طرز سخنوری کے بادشاہ تھے اور آج بھی اردو کی ادبی تاریخ کا ایک علیحدہ باب ان کے کارناموں سے مزین ہوتا ہے۔اس کا بجا طور پر ان کو بھی احساس تھا۔ بلاغت کلام کا یہ نمونہ اور تعلّیِ شاعر قابل ملاحظہ ہے:

به لوح آنچه که زد نقشِ خامۀ تقدیر
ز چار رکن و موالید و هفت چرخ اثیر
رقم ز هر که شده بهرِ حضرتِ شبیر
ز زین فتاده چون آن شه نوشت کلکِ دبیر

بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم فرش بر زمین افتاد

عزیزی ڈاکٹر یاسر عباس نے میرزا دبیر کی فارسی شاعری کو اپنے پی ایچ ڈی مقالے کا موضوع بنایا، جو عام طور سے دبیر کا فراموش شدہ کارنامہ ہے۔ دبیر نے تقریباً تمام اصناف شعر فارسی میں طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقی ہمہ دانی کے جوہر بکھیرے۔ البتہ ان تمام گوہرانِ سخن پر آبِ دُر ذکرِ شہدائے کربلا کا ہے، اور مدحِ اہلِ بیت کا ریحان روح افزا ہے۔ ڈاکٹر یاسر عباس نے نہ صرف کلام دبیر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے بلکہ مختلف اصناف سخن کے فنی و تاریخی پہلوؤں کے حوالے سے بحث کے ساتھ ساتھ محاسن و مطالب کلام کا تحلیل و تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے موصوف تحسین و تشویق کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ ادبی و علمی حلقوں میں اس کوشش کی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر اخلاق احمد آہن
پروفیسر، شعبۂ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
akhlaq.ahan@gmail.com

سوانح حیات

دبیرؔ و انیسؔ سے قبل مرثیہ گوشعرا کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن ان دونوں شاعروں نے مرثیے کو اس عروج تک پہنچا دیا کہ اب اردو ادب کی صنف شاعری میں مرثیے سے بہتر دوسری صنف سخن نظر نہیں آتی۔ غزل کی انفرادیت کی دوسری وجہیں ہیں۔ لیکن اردو مرثیے نے اردو زبان کی اپنی انفرادیت کی بنا پر فارسی اور عربی شاعری کو بھی پیچھے چھوڑ دیا یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی جیسے ادیب کو بھی مرثیے پر توجہ دینے کیلئے مجبور ہونا پڑا۔ جس کے لئے میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ کی کاوشیں قابل مبارک باد ہیں۔

مرزا دبیرؔ کے جد اعلی ہاشم شیرازی صفوی دور کے معروف شاعر اہلی شیرازی کے برادر حقیقی تھے۔ ہاشم شیرازی ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ مرزا دبیرؔ پر مختلف تحقیقی مقالات تحریر کئے گئے سوانح حیات بھی مرتب کی گئی۔ مولوی صفدر حسین نے ''شمس الضحی'' میں جو شجرہ تحریر کیا ہے سب نے اسی کو نقل کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ کا نسب ''شمس الضحی'' میں اس طرح مندرج ہے:

> **"واضح باد که نسب شریف این والا حسبان از جانب پدر عالیشان بجناب مرحوم <u>مرزا هاشم شیرازی</u> می رسد. بدین نهج که <u>مرزا محمد جعفر</u> و <u>مرزا محمد هادی حسین</u> پسران <u>مرزا سلامت علی دبیرؔ</u> ولد مغفور رضوان پناه <u>مرزا غلام حسین</u> طاب ثراه ابن مبرور کامل الایمان <u>مرزاغلام محمد</u> علیه الرضوان پسرعالیشان رفیع المکان بلجاء شریف و وضیع <u>ملا</u>**

محمد رفیع متخلص به رفیع شیرازی خلف فضائل پناه کمالات دستگاه **مرزا محمد هاشم شیرازی** نور الله مرقدهٗ برادر ناظم مناظم سخنوری و عاقد معاقد فضیلت گستری شاعر عدیم المثال و ماهرحمید الخصال مومن کامل عارف آگاه دل **مرزا اهلی شیرازی**"۔[1]

شجرۂ خاندان

نمبر شمار	اسماء گرامی	تاریخ ولادت	تاریخ وفات
۱	ملا ہاشم شیرازی نثار		
۲	مرزا محمد رفیع متخلص به رفیع		
۳	مرزا غلام محمد		۱۲۰۳ء بر بنائے قول غلام حسین پدر دبیر
۴	مرزا غلام حسین	۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۵ء	
۵	مرزا سلامت علی دبیر	۱۱/جمادی الاول ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء	۳۰ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء
۶	مرزا محمد جعفر اوج مرزا ہادی حسین عطارد	۶/جمادی الاول ۱۲۶۹ھ ۵/شعبان ۱۲۷۲ھ	۱۸/اپریل ۱۹۱۷ء

مرزا دبیر کے اجداد میں صرف ان کے والد کی تاریخ پیدائش ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۵ء تذکروں میں پائی جاتی ہے یا جد امجد ملا ہاشم شیرازی کے بھائی مرزا اہلی شیرازی کی تاریخ پیدائش ۸۵۸ھ اور تاریخ وفات ۹۴۲ء تذکروں میں مندرج ہے۔ان تواریخ پیدائش سے ان دونوں شخصیات کے درمیان ۳۳۲ سال کا عرصہ قرار پاتا ہے جو صرف ۸ نسلوں پر مشتمل ہے۔

ا۔ شمس الضحیٰ، ص ۱۴۳

عموماً ایک نسل سے دوسری نسل کا فاصلہ ۳۰ سال قرار پاتا ہے۔ لیکن مرزا غلام حسین سے مرزا دبیر تک ۲۸ سال، مرزا دبیر سے مرزا اوج تک ۵۱ سال اور مرزا دبیر سے مرزا ہادی حسین تک ۵۴ سال کا فاصلہ ہے۔ اب اگر زیادہ سے زیادہ فاصلہ ۵۵ سال فرض کیا جائے تو اس طرح مرزا غلام ۱۱۹۰ھ کے والد مرزا غلام محمد کی تاریخ پیدائش ۱۱۳۵ھ، مرزا محمد رفیع ۱۰۸۰ھ، ملا ہاشم شیرازی ۱۰۲۵ھ قرار پائی جبکہ مرزا ملا ہاشم کے بھائی مرزا اہلی شیرازی کی تاریخ پیدائش تذکروں کے مطابق ۸۵۸ھ ہے جس سے دونوں بھائیوں کے درمیان ۱۶۷ سال کا فاصلہ قرار پاتا ہے۔ زیادہ تر ۵۵ سال کی عمر میں اولاد نہیں ہوتی۔ یہ مفروضہ مرزا دبیر کے چھوٹے فرزند مرزا محمد ہادی المتولد ۵/شعبان ۱۲۷۲ھ کی بنا پر قائم کیا گیا۔ ان معروضات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا دبیر کا مذکورہ شجرہ نسب ادھورا ہے اس میں کچھ نام چھوٹ گئے ہیں۔

تمام تذکروں نے ملا ہاشم شیرازی کو ملا اہلی کا بھائی تحریر کیا ہے ملا ہاشم شیرازی جو دبیر کے جد امجد ہیں کے سلسلے میں مولوی صفدر حسین صاحب رقمطراز ہیں:

> "ملا هاشم شیرازی مبرور در فن انشا پردازی و نثر و حسن تحریر مراسلات و مکاتبات منشیانه وحید زمان و فرید آوان خود بودو درین فن عدیم النظیر و منشی کامل و نثار ماهر او را توان گفت و غایت اشتهار علم و کمال ملا اهلی شیرازی علیه الرحمه مستغنی از اظهار است. حقا که رفعت نام و نشان این بزرگان کالشمس فی نصف النهار بر صغار و کبار روشن و علو مراتب و سمو مناصب این والا مرتبتان بر نزدیک و دور واضح و مبرهن.
>
> " بماهتاب چه حاجت شب تجلی را"۔[1]

مولوی صفدر حسین کے اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملا ہاشم شیرازی ایک بہترین نثر نگار اور انشا پرداز تھے۔ اور مراسلات و مکاتبات میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ ملا ہاشم شیرازی

۱۔ شمس الضحیٰ، ص ۱۴۴

کی تاریخ پیدائش تو کہیں مذکور نہیں البتہ ان کے بھائی مرزا اہلی شیرازی کے احوال نقل کر دئے گئے ہیں۔ ملا محمد بن یوسف اہلی شیرازی المتولد: ۸۵۸ھ شہر شیراز، المتوفی: ۹۴۲ھ مدفن نزد مزار حافظ شیرازی، ۸۴ر سال کی عمر پائی، شاہ اسماعیل اول صفوی کے دور میں شعر گوئی کی بدولت آسمان شہرت پر طلوع ہوئے۔ جو اپنے دور کے بہترین علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دیوان اہلی شیرازی کے مصحح حامد ربانی نے مقدمہ میں اہلی شیرازی کے اصل نام کی جانب اشارہ کیا ہے:

"نام وی محمد بوده است لکن در هیچ کجای آثارش جز تخلص نیاورده است. حتی در دیباچه های نثری که برای مثنوی سحرحلال و قصاید مصنوع و ساقی نامه آورده همه جا از خود به "اهلی شیرازی" تعبیر نموده. و نیز تذکره نویسان نام وی را ذکر نکرده اند و همه "اهلی شیرازی" باضافه لفظ "مولانا"یا "ملا" آورده اند. اما سند معتبر درین باب سنگ آرامگاه اوست که به شیخ محمداهلی شیرازی تعبیر کرده است". [۱]

مولوی صفدر حسین ملا اہلی شیرازی کے احوال میں لکھتے ہیں:

"ملا اهلی در کبر سن در شهور سنه نهصد و چهل و دو در شیراز وفات یافت و ملا میرک در تاریخ فوت او این قطعه انشا فرموده.

درمیان شعرا و فضلا پیر با صدق و صفابود اهلی
رفت با مهر علیؑ از عالم پیرو آل عبا بود اهلی
سال فوتش ز خرد جستم گفت "بادشاه شعرا بود اهلی" ۵

۹۴۲ھ

ثابت لکھنوی نے مدفن اہلی شیرازی کے حوالے سے یہ شعر کہا ہے:

طبع حافظ سے نہ کم تھی طبع اہلی شعر میں
مر کے بھی پہلو نشیں ہیں حافظ شیراز کے [۲]

۱۔ دیوان اہلی شیرازی، مقدمہ مصحح، ص۲ ۲۔ حیات دبیر، جلد ۱ باب اول ص۴

مرزا غلام حسین ابن مرزا غلام محمد (مرزا دبیر کے والد) کے احوال

مرزا غلام محمد کے احوال کے سلسلے میں تذکرے خاموش ہیں صرف ''شمس الضحیٰ'' میں شامل ایک فرمان شاہی سے کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔جس کے مطابق اسلاف مرزا غلام حسین، خدا دوست اور دیندار بزرگ تھے۔عہدہ منشی پر فائز تھے لیکن عہدہ ہائے بلند کو شوق عبادت الٰہی میں ترک فرمایا اور ذکر الٰہی میں زندگی بسر کی۔آپ کی عظمت کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ غازی ابو المظفر جلال الدین نے اپنے فرمان شاہی میں مرزا دبیؔر کے دادا کے نام کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت تحریر کی ہے:

> **"چون بعرض مقدس و معلی رسید که فضیلت و شریعت مآب تقوی و صلاح دستگاه غلام محمد ابن ملا محمد رفیع ولم ملا محمد هاشم شیرازی مناسب جلیله سرکار از خیال مآل اخری رضینه برضای جناب باری عز اسمه و ما بدولت و اقبال بانتهای تدین جمال رسانیده باکراه از ترک مناسب متعلقه و تعلقات حادث از مزید شوق طاعت واجب الوجود اعتکاف ساخته"۔**[1]

مزید لکھا کہ ان کی دیانتداری معراج کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ایک خدا ترس انسان کے لئے یہی کافی ہے کہ لوگ اس کو نیک خیالات سے یاد کریں۔

مرزا غلام حسین کی والدہ کا انتقال ان کی صغرسنی میں ہی ہو گیا تھا لہذا مرزا غلام محمد نے عقد ثانی کر لیا۔ دوسری زوجہ نے مرزا غلام حسین کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا۔سوتیلی ماں کے ناروا سلوک سے عاجز آ کر اپنے استاد کے ساتھ گھر چھوڑ کر شاہجہاں آباد میں اپنے والد کے قریبی دوست مرزا فتح علی خاں ابن فضل علی خاں کے گھر میں پناہ لی۔مرزا فتح علی خاں کے

۱۔حیات دبیر دیباچہ باب اول، جلد ۱، ص الف

ساتھ ان کے والد کے اچھے تعلقات تھے اس لئے پدرانہ شفقت کی مانند انہوں نے نہ صرف گھر میں پناہ دی بلکہ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک بھی کیا۔ مرزا غلام حسین نے علماء، نوابین و روساء شاہجہان آباد، اکبر آباد و لکھنو سے ایک خط کے ذریعہ اپنی صداقت و نجابت کی گواہی چاہی اسی خط میں خود کے حالات بھی بیان کئے ہیں مرزا غلام حسین کا وہ خط یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

"گواهی می طلبد بصدق و شهادت می خواهد بحق از روسای لکهنئو، شاهجهان آباد، اکبر آباد ننگ و عار این مسمی به غلام حسین ابن مرزا غلام محمد خلف مرزا رفیع ولد مرزا محمد هاشم شیرازی برادر عینی اهلی شیرازی بدین مضامین صداقت آمین از قدیم الایام بزرگان اباعن جد احقر العباد در شیراز که موطن و مولد آنهابوده همواره بمناصب جلیله و مدارج رفیعه ممتاز بودند. چون بسبب نا مساعدت ایام جلای وطن ساخته وارد اکبر آباد شدند . مرزا عنایت الله خان ابن مرزا ابو المظفر خان آثم ناظم صوبه کشمیرحقیر را از اکبر آباد شاهجهان آباد بخانه مرزا فتح علی خان ابن مرزا فضل علی خان که با پدر صیغه اخوت و روابط قدیم می داشتند آورده و حال مهربانی مادر مهربان حالی ساخته جناب خان صاحب موصوف متاسف گشته مثل بزرگان سلف که فرزند آشنا را فرزند خود می دانستند حقیر را بخانه خود با هزار شفقت و محبت نگاه داشتند"۔[1]

والد جب سفر سے واپس ہوئے تو بیٹے کو تلاشتے ہوئے شاہجہاں آباد پہنچے اور بیٹے کو اپنے ساتھ لے آئے لیکن تیرہ سال کی عمر میں والد نے بھی داغ مفارقت دے دیا۔ سوتیلی ماں اور دیگر رشتہ داروں نے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا واپس مرزا فتح علی خاں کے پاس پہنچے۔ دہلی میں اس

ا۔ حیات دبیر، باب اول، ص الف تا دال

وقت غارتگری مچی تھی تو مرزا فتح علی خاں نے دہلی سے لکھنو ہجرت کی اور اپنے ساتھ مرزا غلام حسین کو بھی لکھنو لے آئے۔

مرزا دبیر کے اجداد و اسلاف کے سلسلے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اعلی خاندان کے فرد تھے۔ آباء و اجداد ایرانی الاصل تھے اور بعد میں ہندوستان آئے۔ اپنے دور کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے اور مناسب عہدوں پر فائز رہے۔ اب جن تذکرہ نگاروں نے اس کے برخلاف لکھا ہے ان کا خیال محض افترا ہے۔ مولوی صفدر حسین نے ''شمس الضحی'' میں چند ایسے خطوط و استشہاد ناموں کو نقل کیا ہے جن سے مرزا دبیر کے اجداد کی ذات اور ان کے مراتب پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان استشہاد ناموں سے ان محققین کے اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا بھی حل مل جاتا ہے جنہوں نے مرزا دبیر کے والد کو کاغذ فروش لکھا ہے۔ مثلاً تذکرہ سراپا سخن میں سید محسن علی موسوی نے تحریر کیا ہے:

> ''دبیر مرثیہ گوئی میں طاق صف آرائی اور مضمون خیزی میں شہرہ آفاق مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین متعلقان مرزا آغا جان کاغذ فروش باشندۂ لکھنو ارشد تلامذہ میر مظفر حسین ضمیر مرثیہ گو۔[1]

تذکرہ سخن شعرا میں عبدالغفور نساخ نے بھی آپ کے لیے یہی لکھا ہے:

> ''مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین کاغذ فروش لکھنوی شاگرد میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی مرثیہ اچھا کہتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو راقم نے ان کو عظیم آباد میں دیکھا ہے''۔[2]

ان اعتراضات کے جواب کے لیے ثابت لکھنوی کے ذریعہ حیات دبیر میں نقل کیے گئے نوابین کے استشہاد نامہ کافی ہیں۔ جن میں سے ایک دو کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی الدین ابوالمظفر جلال الدین نے (جن کی مہر میں ۱۱۷۳ھ کندہ ہے) ایک استشہاد نامہ آپ کے جد کے نام لکھا تھا۔ جس کے ابتدائی کلمات یہ ہیں۔

''فی الحقیقت بزرگان مستشهد از شرفای شیراز و بسرکار ما

۱۔ تذکرہ سراپا سخن، ص ۷۹ ۲۔ تذکرہ سخن شعرا، ص ۱۵۸

بدولت بعهدهایی جلیله ممتاز بوده اند. حقا که جناب صداقت مآب اعنی مرزا غلام حسین صاحب خلف الصدق مرزا غلام محمد طاب ثراه از شرفای ذوی الاقتدار و نجبایی عالی انبار خط پاک شیراز هستند و جدهٔ ماجده مفتخم الیه و جده ماجده اینجانب هر خواهر عینی بوده اند."

(آفتاب جنگ ۱۱۹۰ھ محمد نورین خان بهادر) [۱]

(ترجمہ) *"حقیقت تو یہ ہے کہ آفتاب جنگ کے مطابق مرزا غلام حسین شرفائے شیراز سے ہیں اور مرزا دبیر کی پردادی اوران کی دادی سگی بہنیں تھیں"۔* اسی طرح کے دیگر استشہاد نامہ جو مولانا سید دلدار علی غفرانمآب، علی مراد خان بہادر داروغہ دیوان خانہ شاہ عالم بادشاہ اور مختار خان بہادر رئیس دہلی وغیرہ کے تحریر کردہ استشہاد ناموں کو بطور سند پیش کیا جا رہا ہے تا کہ ادب دوست حضرات ان کا مطالعہ کر کے حقیقت کو خود اپنی فکر کے آئینہ میں پرکھیں۔

﴿مکتوب جناب غفرانمآب مولوی سید دلدار علی صاحب قبله نور الله مرقده﴾

جناب مرزا صاحب کرم فرمای دوستان مستجمع الطاف و احسان عالی مراتب والا مناقب مرزا غلام حسین صاحب دام مجده،

بعد سلام مسنون الاسلام واضح رای شریف باد که مبلغ پانصد روپیه منجمله زکوة و خمس که بدست مسمی غلام حیدر فرستادند رسید انشاء الله تعالی بمستحقین مومنین تقسیم کرده خواهد شد زیاده والسلام.

مرقومه چهارم شهر رمضان المبارک ۱۲۱۶ھ هجری نبویؐ [۲]

مذکورہ مکتوب مولوی جناب غفرانمآب کے متن کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف غلام حسین صاحب مولانا کو خمس و زکوۃ باقاعدہ ارسال کیا کرتے تھے یعنی احکام

۱۔ حیات دبیر، ج۱، باب اول، ص جیم　　　۲۔ شمس الضحی، ص۱۵۴، ۱۵۵

شرعیہ کی مکمل پابندی کیا کرتے تھے جس سے آپ کے اقتصادی حالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خمس و زکوۃ کی ادائیگی کے لیے صاحب استطاعت ہونا لازمی ہے۔اور اس زمانے میں پانچ سو روپے خاصی اہمیت کے حامل تھے۔(خط کے آخر میں ۱۲۱۶ ہجری نبوی درج ہے) جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا دبیر کے والد ۱۲۱۶ھ میں لکھنو سے باہر تھے۔

مندرجہ مکتوبات کے متون کے مطالعہ سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کے والد کی نسبت آغا جان کاغذ فروش والا شوشہ سراسر لغو و افترا ہے اور کچھ نہیں۔اس کے علاوہ افضل حسین ثابت لکھنوی نے اس افترا پردازی کی توجیہ اس طرح بیان کی ہے۔

> ''میں نے لکھنو کے بعض معمر آدمیوں سے سنا ہے کہ وہ آغا جان اور مرزا غلام حسین۔ یہ دونوں صاحب بزرگوں کے وقت کا اسباب خانہ داری، دوشالہ، ہتھیار، ظروف، نقرہ و طلا وغیرہ جو بہت کچھ تھا بیچ بیچ کر کھایا کئے۔اس زمانہ میں کاغذ بھی بہت قیمتی ہوتا تھا۔خصوصاً ایرانی و کشمیری کاغذ بہت ہی قیمت پاتا تھا۔ممکن ہے کہ ان صاحبوں کے ساتھ کچھ کاغذ بھی ہو اور وہ بیکار سمجھ کر بیچ دیا ہو۔ یاروں کو شگوفہ ہاتھ آیا اور کاغذ فروش لکھ دیا۔حالانکہ کاغذفروشوں کا (مثل کاغذ سازوں کے) کوئی فرقہ یا قوم نہ شاہی زمانہ میں تھا نہ آج ہندوستان بھر میں کہیں ہے۔ بلکہ پہلے بھی مختلف قوموں کے شریف آدمی کاغذ بیچتے تھے اور آج بھی۔ میں اس پر اتنا اور لکھنا چاہتا ہوں کہ اگر واقعی بھی یہ بزرگوار کاغذ فروش ہوتے جب بھی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ کیونکہ یہ فخر اسلام کو حاصل ہے کہ پیشہ تجارت سے کوئی شخص رذیل نہیں ہو جاتا بلکہ **فحوای الکاسب حبیب الله** شرافت بڑھ جاتی ہے''۔[۱]

۱۔حیات دبیر، ج۱،ص ۱۱،۱۲

مرزا دبیر کی ولادت:

مرزا دبیر کی ولادت ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو بلّی ماران دہلی میں ہوئی۔ "بخت دبیر" مادہ تاریخ ولادت (قمری) ہے۔ والد کا نام مرزا غلام حسین ولد غلام محمد ولد ملا محمد رفیع ولد ہاشم شیرازی نثار تھا۔[1]

سلسلۂ نسب ایران کے معروف شہر شیراز سے ہے لہٰذا ''شیرازی'' کہنا بھی جائز ہے۔ اجداد مرزا دبیر شیراز میں ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ پھر زمانے کی ناموافقت کی بنا پر ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور دہلی حکومت میں عہدہ ہائے جلیلہ پر رہ کر کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ جد کا نام مرزا محمد رفیع تھا تخلص بھی رفیع فرماتے تھے شاعر تھے مگر زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل نہ ہوئی۔

مرزا دبیر کا مذہب:

مرزا صاحب کے مذہب کے سلسلے میں بھی تذکرہ نگاروں نے اختلاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً صاحب ''صبح گلشن'' نے آپ کو نسلاً ہندو قرار دیا ہے۔ سید علی حسن خاں لکھتے ہیں:

> **"دبیر نامش سلامت علی در اصل هندو نژاد بود بطیب خاطر بشرف اسلام مشرف شده مذهب شیعه اختیار نمود".**[2]

لیکن اسی دور میں ہی دانشوران لکھنو نے اس کی تردید میں مہم چھیڑ دی تھی جیسا کہ صاحب '' حیات دبیر'' نے مرزا حیرت (مالک کرزن گزٹ دہلی) کے حوالے سے لکھا ہے:

> '' انہوں نے ہمارے مرزا صاحب کو کایستھ نومسلم ہی لکھ دیا۔ شاید مرزا حیرت نے نواب نصیر الدولہ کے درباری شاعر جواہر لال دبیر کا حال سنا ہو اور وہ مرزا صاحب کو سمجھ بیٹھے ہوں''۔[3]

۱۔ حیات دبیر، ج۱، ص۸ ۲۔ صبح گلشن، ص۱۶۳ ۳۔ حیات دبیر، ص۱۵

ثابت لکھنوی مرزا صاحب کے مذہب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''از بسکہ مرزا صاحب مرحوم کے کئی استاد اخباری تھے۔ بعض حضرات مرزا صاحب کو بھی اخباری مسلک سمجھتے تھے۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ مرزا صاحب ایک محتاط اصولی شیعہ تھے''۔ ۱؎

مولوی صفدر حسین نے مرزا دبیرؔ کے فرزند ارجمند کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ جن سے مرزا دبیر کے مذہب و عقیدے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

"والد مرحوم که نهایت عابد و پارسا و صدوق و در آخر عمربشرف زیارت عتبات عالیات مشرف شده. در اثناء معاودت بعالم قدس و مقام انس ارتحال فرمود و مسود اوراق هم آنجناب را می شناخت و برکمال ایمان و اخلاص آن بزرگوار اطلاع داشت و آن جناب را با جناب ممدوح تعلقی و توسلی نبود حکایات بسیار و روایات بیشمار در باب قبولیت کلام جناب مداح اهلبیتؑ اطباب شنیده بودم"۔ ۲؎

مرزا دبیرؔ کا زہد و تقوی:

مرزا دبیر مذہب کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ اسی لئے اپنی تخلیقات نظم ونثر میں صرف مذہبی موضوعات پر طبع آزمائی فرمائی۔ غزل جیسی صنف سخن (جس میں ہر شاعر اپنی فنکاری دکھاتا ہے) سے بھی مرزا دبیر نے خود کو دور رکھا اور اس درجہ دور رکھا کہ خود غزل کہنا تو دور کبھی دوسرے شعراء کی غزلیں سننا بھی موقوف فرما دیا۔ شاید غزل سے بے اعتنائی کی وجہ بالفاظ شاد:

''اس زمانے کے شعرا کی بے قیدیوں اور رندانہ و واوباشانہ مضامین نے غزل سرائی کو بدنام کر دیا تھا''۔ ۳؎

۱۔ حیات دبیر، ج ۱، باب دوم، ص ۲۶ ۲۔ شمس الضحی ص ۱۰۷، ۱۰۸ ۳۔ فکر بلیغ، ص ۱۶۶

ثابت لکھنوی نے اپنے نانا کی زبانی غدر ۱۸۵۷ء سے قبل کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

''ایک شادی میں جناب مرزا صاحب بھی شریک تھے میں بھی تھا۔ از بسکہ محفل میں ارباب نشاط بھی تھے۔ صاحب خانہ نے ثقہ آدمیوں کے واسطے علیحدہ ایک مکان تجویز کر دیا تھا۔ باقی ہمہ وشا محفل رقص و سرود میں تھے۔ مرزا صاحب ثقہ آدمیوں میں تھے۔ مجھے دس بجے رات کے بلا بھیجا۔ میں دوسری محفل میں سے گیا۔ تو دیکھا کہ شعر و شاعری کے نکات بیان ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور مرزا صاحب کو اس بحث میں محو دیکھ کر پھر دوسری محفل میں چلا آیا۔ جب باتوں سے مرزا صاحب کو فراغت ہوئی۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ پھر آدمی میرے بلانے کو بھیجا۔ مجبور پھر میں محفل رقص و سرود میں سے گیا۔ فرمایا ہم تم کو جنت کی طرف کھینچتے ہیں ۔تم بھاگتے ہو۔ میں ان جناب کی خدمت میں بہت گستاخ تھا۔ عرض کی ۔کیا یہ محفل جنت ہے۔ فرمایا اس وقت ایسی ایسی باتیں ہوئیں کہ تم سنتے تو روح خوش ہو جاتی۔ میں نے عرض کی حضرت' **انما الاعمال بالنیات**'۔ خدا پلک نواز ہے۔ وہ چاہے تو وہاں بھی بخشش کا وسیلہ پیدا کر دے۔ فرمایا توبہ کرو **استغفر اللہ** محفل رقص کی نسبت ایسا کہتے ہو۔ '**الغناء اشد من الزناء**' میں نے عرض کی سنئے تو سہی۔ میں تو خدا کی رحمت کا ذکر کرتا ہوں ۔وہ چاہے تو اسی جگہ وسیلہ بخشش پیدا کر دے۔ فرمایا بھلا مجھے سمجھائیے تو وہاں کیونکر وسیلہ بخشش ہوسکتا ہے۔ میں نے عرض کی ۔مثلاً آپ کا کلام منظوم کوئی طوائف گائے۔ اور ہمارا دل کسی شعر پر خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ تو فرمائیے خدا دل کو دیکھتا ہے، ظاہر کو نہیں دیکھتا۔ ممکن ہے گناہ بخش دے۔ فرمایا یہ تو '**بناء الفاسد علی الفاسد**' ہوئی۔ جب گانا حرام ہے تو جو اشعار گائے جائیں گے، چاہے وہ معرفت ہی میں ہوں ۔

باعث مغفرت نہیں ہو سکتے۔ اور یہ کیا آپ نے فرمایا۔ کیا میری غزل کسی طوائف نے گائی تھی۔ میں چپ ہو گیا۔ فرمایا: سچ کہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اور اس غزل کا مطلع سنا کر کہا یہ غزل حسین باندی طوائف نے گائی تھی۔ مرزا صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور کچھ وظیفہ پڑھ کر نماز شب پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ خیر رات گئی بات گئی۔ دوسرے دن جو میں نو دس بجے پہنچا۔ تو آدمی نے کہا دیوان خانہ میں مرزا صاحب ہیں اور حسین باندی طوائف بھی ہے۔ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے جایئے چاہے نا جایئے۔ میں الٹے پاؤں پھر آیا۔ مگر دل میں کہتا تھا کہ یا تو مرزا صاحب نے میرے قول کی تصدیق کی غرض سے حسین باندی کو بلایا ہوگا۔ یا اس سے سیدھے سادے طور پر اپنی غزل سنی ہوگی۔ دوسرے روز جو میں شاہ گنج میں ہو کر نکلا تو حسین باندی کا لڑکا ملا۔ اس نے حسین باندی کا یہ پیام دیا کہ آپ اجازت دیں تو میں کسی وقت حاضر ہوں۔ میں نے کہا اچھا پانچ بجے شام کو آنا۔ شام کو جب وہ آئی تو مجھ سے کہا۔ میر صاحب آپ نے مرزا صاحب سے یہ ذکر کر دیا کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی۔ میں بولا ہاں باتوں باتوں میں میں نے کہا تو تھا، پھر کیا ہوا؟ کہا مرزا صاحب نے اول تو مجھ سے پوچھا۔ تم کو میری کتنی غزلیں یاد ہیں؟ میں نے جواب دیا بس ایک۔ انہوں نے مطلع پوچھا، میں نے مطلع پڑھ دیا۔ پوچھا کتنے شعر یاد ہیں؟ میں بولی، نو دس شعر، پوچھا رات کو یہ غزل گائی تھی؟ میں نے کہا جی ہاں، یہ سن کر وہ گھر میں اٹھے چلے گئے۔ اور ایک توڑہ پانچ سو روپیہ کا ایک رومال میں باندھ کر لائے۔ مجھ سے فرمایا یہ روپیہ تم اپنی ڈولی میں رکھ لو۔ آج سے اس غزل کو نہ گانا۔ میں نے بھتیرا کہا کہ میں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤنگی، آپ

ا۔ حیات دبیر، ص ۸۶ تا ۸۸

روپیہ رہنے دیجیے اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا نہیں، اب میں یہ نکال چکا۔
تم اس کو کسی کار خیر، عزاداری وغیرہ میں صرف کرنا''۔ ۱؎

اس طویل واقعے کو نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مرزا دبیر کی احکام شرعی پر عمل پیرائی کا علم ہو سکے۔

مولوی صفدر حسین مرزا دبیر کے زہد و تقوی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"زهد و تقوی و ورع و اتقا از بیان وصف زهد آن جناب ناطقه حیران و قلم دو زبان در تحریر آن سر در گریبان است از ابتدای جوانی و آغاز ایام نشاط و کامرانی دست از دنیای فانی ولذات نفسانی شسته و عنان توسن حظوظ جسمانی و مردات نفس انسانی گسسته مرادهای خود را در رضای ایزد باخته و هوای نفس سرکش را محکوم فرمان خود ساخته ضمیر منیر آن سالک منازل حقیقت مطلع انوار خورشید عالم جبروت است و چمن زار باطن آن گل سرسبد گلبن معرفت مورد باران سحاب اسرار ملکوت هادی طریق عشق ربانی است". ۱؎

صاحب ''تلاش دبیر'' کاظم علی خاں غزل گوئی کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''مرزا دبیر جیسے پابند شرع، متقی اور پرہیزگار ذاکر منبر رسول کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ان کے دور شباب کی غزلیں لکھنو کے عام رواج کے مطابق ارباب نشاط کے ذریعے آلات موسیقی کے ساتھ تقریبات میں گائی جائیں''۔ ۲؎

شاد عظیم آبادی نے بھی فکر بلیغ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے مرزا دبیر کی مذہبی عقیدت عیاں ہو جاتی ہے۔ شاد لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ میں نے گستاخانہ عرض کیا کہ حضور نے غزلیں تو بہت فرمائی ہوں گی۔ ایسے متاثر ہوئے گویا میں نے گناہ کبیرہ کو یاد دلا دیا۔ فرمایا کہ جانے دیجئے وہ دن ہی اور تھے''۔ ۳؎

۱۔ شمس الضحی، ص ۱۳۱/۱۳۲ ۲۔ تلاش دبیر، ص ۸۴ ۳۔ فکر بلیغ، ص ۱۶۶

مرزا دبیر کی استعداد علمی:

دبیر نے آنکھیں تو دہلی میں کھولیں لیکن شعور لکھنو کی ادب نواز فضا میں پایا۔ اور بہت جلد اپنی شہرت کا سکہ تمام ادبی حلقوں میں منوا لیا جس دور میں ضمیر، خلیق اور دلگیر جیسے شعراء مقبول عام تھے اس دور میں مرزا دبیر نے خود کو منوایا۔ ''فسانۂ عجائب'' میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے جن مرثیہ گویوں کا نام لیا ہے ان میں دبیر بھی ہیں:

> ''مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر، صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر، مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احساں اہل دول نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ وسلام کا دیوان کثیر فرمایا۔'' ۱

عربی و فارسی کی تمام مروجہ کتابیں با قاعدہ پڑھی تھیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں۔

> ''مرزا صاحب کی علمی حیثیت بہت بلند تھی۔ عربی و فارسی میں کامل دستگاہ تھی۔ تمام نقلی و عقلی علوم پر حاوی تھے۔ اور طبقۂ علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔'' ۲

مرزا دبیر کا اخلاق:

حسن اخلاق شخصیت سازی میں سب سے بڑا معین و مددگار ہوتا ہے۔ اگر انسان میں اخلاق نہ ہوتو کچھ بھی نہیں ہمارا پیارا دین اسلام حضور اکرمؐ کے اخلاق کی بدولت ہی پھولا پھلا۔ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار اخلاق کا ہے۔ اسلام پہلے صاحب اخلاق دیکھنا چاہتا ہے جس کا جس قدر اخلاق اچھا ہوگا اس کی اسی قدر پزیرائی کی جائیگی۔ مرزا دبیر مکارم اخلاق سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ صاحب شمس الضحی اس ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

> **"حقیر خود بکرات و مرات مشاهده کرده که در محفل عالی آن متعالی اخلاق با امرا و غربا با سمت تساوی دارد". ۳**

۱۔ فسانۂ عجائب، ص ۱۱۷ ۲۔ دبستان دبیر، ص ۵۵ ۳۔ شمس الضحی، ص ۱۳۳

مرزا دبیر کی سخاوت:

سخاوت بھی ایمان کا جز ہے جو انسان زہد و تقوی سے مزین ہوگا اس میں سخاوت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں میں بہت بڑے بڑے سخی گزرے ہیں۔ مرزا دبیر کی سخاوت بھی مشہور تھی۔ جو سائل بھی آپ کے دروازے تک آیا وہ خالی ہاتھ نہ پلٹا۔ مولوی صفدر حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مرزا سلامت علی متخلص بدبیر سلمه الحکیم و الخبیر منبع جود و سخا مخزن فیض و عطا است از ظهور کرمش اگر از جهان صحیفه ذکرحاتم طی گردد بجا است و از کثرت عطایش اگر روان جعفر برمکی در غرقاب خجالت غرق شود رواست امیریست سخاکیش و رئیسی است کرم اندیش بحرعمان جود و احسان است و فرمان روای کشور فیض و امتنا در بخشش بدریغ آنچنان مجبول طبیعت بوده که ذات با برکاتش در عرصه همت گوی سبقت از کریمان ماضی و حال ربوده و ریاض بذل و اکرام از فطره افشانیهای سحاب دست گوهر بارش همواره با آب و تاب است ..... چون آثار احتیاج از ناصیه اوضاع مستمندی مشاهده و مرض جانکاه و پریشانی از چهره احوال دردمندی ملاحظه می نماید در چاره درد او چابکی کرده نمی گزارد که وی از غایت اضطراب لب اظهار بعرض احوال خود کشاید و عطا را بعد از طلب سخا نمی داند بلکه از قبیل شرم و حیا می شناسد و نیز از محاسن حمیده آن برگزیده آنست که بخوی عطیات خودرا واصل می سازد که باعث خفت و خواری و سبب خجلت و شرمساری درد مند نمی گردد و اگر عزیزی می باشد که داد نقد لائق بحالش

نمی باشد نقد بجنس تبدیل می کند و اگر طبعش از گرفتن بدست امتناع می نماید جهت وی ارسال می دارد". ۱؎

مرزا دبیر کے پاس اکثر لوگ امراء، نوابین اور بیگمات کی خدمت میں سفارش کے لئے آتے تھے اور اگر کسی کو مرزا صاحب کی سفارش سے فائدہ ہوتا تو سفارش سے کبھی گریز نہیں فرماتے تھے۔ یا تو خود ساتھ چلے جاتے یا کبھی کوئی رقعہ یا نامہ تحریر فرما دیتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ثابت لکھنوی نے نقل کیا ہے:

''جناب الطاف حسین عرف نواب منی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جب میرے والد مرحوم نے ۱۲۶۹ھ میں انتقال فرمایا۔ تو میرا سن اڑھائی برس کا تھا۔ جناب مرزا صاحب مرحوم مجھ کو خود بادشاہ اودھ نواب واجد علی شاہ مرحوم کے دربار میں لیکر گئے۔ اور میرے باپ کی جگہ (کہ سواروں میں ان کا نام شامل تھا) میرا نام لکھوا دیا۔ پھر میں اسی عمر میں شمس آباد میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ چلا آیا۔ یہاں ایک مدت تک مرزا صاحب میری تنخواہ خزانہ شاہی سے لے کر بھجوایا کئے''۔ ۲؎

مرزا دبیر کا میر ضمیر کے روبرو زانوے تلمذ تہہ کرنا:

مرزا دبیر نے گیارہ یا بارہ برس کے سن ۱۲۳۰ھ میں شاعری کی ابتدا کی۔ اور میر مظفر علی ضمیر لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ اس وقت میر ضمیر کی مرثیہ گوئی میں بہت شہرت و مقبولیت تھی۔ ثابت لکھنوی نے مرزا دبیر کے میر ضمیر کے شاگرد ہونے کے واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔:

''گیارہ بارہ برس کی عمر میں تحصیل فارسی اور کسی قدر عربی کی فرما چکے تھے کہ رجحان طبعی دیکھ کر ان کے والد ماجد میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں لائے۔ یہ ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ کا ذکر ہے اور میر ضمیر کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ یہ

۱۔ شمس الضحیٰ، ص ۱۲۵ تا ۱۲۷   ۲۔ حیات دبیر، ص ۶۹/۷۰

بندہ زادہ ہے اس کو مداحی اہلبیتؑ کا شوق ہے۔ میر ضمیر صاحب نے صاحب زادے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ صاحب زادے نام آپ کا، عرض کی، سلامت علی کہتے ہیں۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو، بتلایا۔ جب میر ضمیر صاحب کو باتوں باتوں میں معلوم ہو گیا کہ ذی استعداد و ذہین لڑکا ہے۔ دل میں بہت خوش ہوئے۔ فرمایا جو کچھ کہا ہو مجھے سناؤ۔ مرزا صاحب نے یہ قطعہ پڑھا۔

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس کی شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ سن کر میر ضمیر اور تمام حاضرین پھڑک گئے۔ کوئی صاحب بول اٹھے۔ صاحب زادے چشم بد دور بلا کی طبیعت پائی ہے۔ میر ضمیر صاحب نے پھر پوچھا۔ تخلص کیا کرتے ہو۔ عرض کیا۔ تخلص ابھی تک نہیں رکھا۔ حضور کوئی تخلص تجویز فرمادیں۔ فرمایا 'دبیر' اور پھر کہا **'بر دبیران روشن ضمیر مخفی ومحتجب نماند'**۔ اور مسکرا کر بولے۔ ''صاحب زادے میں نے اپنے نفس و نام پر تم کو مقدم کر دیا کہ اس مشہور جملے میں دبیر اول، ضمیر بعد کو ہے۔ میں تم کو بتاؤں گا، ضرور کہا کرو''۔[1]

اس سے کچھ مختلف انداز میں شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

''یاد آتا ہے کہ خود فرماتے تھے کہ کوئی سوزخوان ہم محلّہ تھے۔ میر ضمیر کے ایک مرثیے کا ورق جاتا رہا تھا۔ مرزا صاحب کی عمر بیس اکیس برس کی ہوگی۔ غزلیں، سلام اور مرثیے بھی کہنے لگے تھے۔ میر مکّھو نامی ایک شخص صاحب سخن تھے، انہیں کو دکھالیا کرتے تھے۔ ان سوزخوان نے پوچھا کہ فلاں مرثیہ میر ضمیر کا آپ کے پاس ہے ایک ورق جاتا رہا ہے۔ نقل چاہتا ہوں۔ چنانچہ خود دس بارہ بند کہہ کر جوڑ ملا دیا۔ جس مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا گیا، میر ضمیر بھی موجود تھے، ان بندوں کو سن کر بھیانک ہوئے۔ سوزخواں سے پوچھنے پر

ا۔ حیات دبیر، ص ۲۲/۲۳

حقیقت معلوم ہوئی کہا کہ ڈرو نہیں۔ ان صاحب زادے کو میرے پاس ضرور لے آنا۔ میر ضمیر کا حکم ایسا نہ تھا کہ ٹالا جاسکتا۔ یہ دوڑے ہوئے میرزا صاحب کے پاس آئے اور ان کو بلا لے گئے۔ میر ضمیر نے پوچھا صاحب زادے یہ بندتم نے کہہ کر لگائے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر کہا قصور تو ہوا۔ پوچھا کس سے اصلاح لیتے ہو۔ ان کے منہ سے نکل گیا اب تو حضور ہی کی کفش برداری چاہتا ہوں، یہ تقریب شاگردی کی ہوئی۔[1]

شاد عظیم آبادی کی بیان کردہ روایت قابل قبول نظر آتی! مگر ایک تو آپ نے شروع میں ہی کہا کہ ''یاد آتا ہے'' یعنی وثوق سے نہیں کہا۔ دوسرے شمس الضحیٰ (جو مرزا دبیر کی زندگی میں تصنیف ہوئی اور آپ کے زندگی نامہ کی نقش اول ہے۔) میں مولوی صفدر حسین نے مرزا دبیر کی شاعری کا آغاز گیارہ برس کی عمر میں بتایا ہے اور ساتھ ہی میں میر ضمیر سے شرف تلمذ کا بھی ذکر کیا ہے جس میں ایسے کسی واقعے کا تذکرہ نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

''صفات او خبری داده بود در آغاز
که شاه ملک معانی شود در آخر کار

بنابر آن طبع شریف خود را متوجه انشاء اشعار و تنظیم مضامین آبدار دید از نظم غزلیات و هزلیات و لغویات بلکه قصاید مدح ملوک و سلاطین و حکام و وصف امراء ذوی الاحتشام دست کشید و از سن یازده سالگی سالک مسالک رضای ایزدی و انشاء اشعاردرمناقب و مصائب مقبولان بارگاه سرمدی گردید و در مبداء حال و آغاز این اشتغال منظومات خودرا بزیور اصلاح جناب تقدس مآب تورع انتساب زاهد عدیم النظیر جناب میر مظفر حسین المتخلص بضمیرکه دران آوان از زمرۀ شعرا اهل ایمان بوفور فضل وکمال عرفان ممتاز و درمیان این فرقه علیه سراپا امتیاز بود رسانید و در سن یازده و دوازده سالگی آنچنان در نظم و نسق سخن و بندش مضامین نو وکهن ید طولی ودستگاه تام داشت که شاعران با نام و نشان را در

۱۔ فکر بلیغ، ص ۱۶۲

سن چهارده سالگی میسر نگشته بود "ذلک فضل الله یوتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم" در اندک مدت و زبان یسیر بسبب جودت طبع وحدت ذهن دراک و صفاء قریحه وصحت ادراک سرآمد شعرای عالیشان و پیشرو سالکان طریق عرفان شد"۔[۱]

ثابت لکھنوی نے مذکورہ بالا واقعے کو بعینہٖ بیان کیا ہے بعدہٗ مزید لکھتے ہیں:

''میں نے بہت سے تذکرے دیکھے۔ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر نظر آئے۔ مگر دبیرؔ تخلص مرزا صاحب سے پہلے کسی شاعر کا مجھے نظر نہیں آیا۔ منشی مظفرعلی اسیرؔ اسی موقع کے لئے فرما گئے ہیں:

شاعران حال کیا مضمونِ نو باندھیں اسیرؔ
ڈھونڈتے ہیں یہ تخلص بھی نیا ملتا نہیں [۲]

شاید ثابت لکھنوی نے جو دعویٰ کیا ہے اس میں حتی الامکان وہ درست ہو سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر نریندر بہادر شریواستو نے اپنی تالیف ''نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی میں یوگدان'' کے صفحہ ۱۲۱ر پر جواہر لال دبیرؔ کا ذکر کیا ہے جو قوم کے کایستھ تھے اور نواب نصیرالدولہ کی ملازمت میں تھے۔ جس سے ثابت لکھنوی کا یہ دعویٰ جوش محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

میر ضمیر کی شاگردی کے سلسلے میں مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''مرزا دبیرؔ خاندانی شاعر نہ تھے۔ لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا''۔[۳]

الغرض روایات کے قدرے اختلاف کے باوجود اکثر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ آپ میر ضمیر کے شاگرد تھے۔

۱۔ شمس الضحیٰ، ص ۹۸/۹۷ ۲۔ حیات دبیر، ص ۵۲ ۳۔ آب حیات، ص ۳۷۵

مرزا دبیرؔ کی زود گوئی:

مرزا صاحب کی زود گوئی کے حوالے سے شاد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''میرزا صاحب کی ابتدائی مشق اور زود گوئی کا حال تعجب انگیز ہے۔ شب کو تیس چالیس بند مرثیے کے کہہ کر صبح کو میر ضمیر سے اصلاح لینے پہونچے۔ اصلاح لے کر دو پہر کو پھرے آتے ہیں۔ راستے میں کسی سوزخوان نے گھیرا کہ مجھکو پرسوں مجلس پڑھنی ہے خدا کے لئے ایک بیس بند کا مرثیہ زندان کے حال میں کہہ دو، اصرار بڑھا تو آپ نے کہا ساتھ چلے آیئے۔ راستے ہی سے عنوان سوچتے اور ذہن میں کتنے مصرعے لئے سوزخوان کو ساتھ لیکر گھر پر آئے۔ بیس پچیس بند کا مرثیہ کہہ کر ان کے حوالے کر دیا۔ کھانا کھایا، لیٹے۔ پھر سہ پہر کو استاد کے پاس جانا ہے۔ صبح والے مرثیے میں تیس چالیس بند کا اضافہ کر کے سر شام پھر میر ضمیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اصلاح تو کب ہوتی ہے، کیونکہ اکثر اس وقت مجمع ہو جاتا تھا، یا خود کہیں چلے جاتے تھے۔ یہ حضرت بیٹھے ہیں۔ موقع ملا تو خیر، ورنہ گھر چلے آئے۔ کبھی کبھی رات بھر بیٹھ گئے۔ دو، دو مرثیے کہہ ڈالے ورنہ بارہ ایک بجے شب سے تو ضرور اٹھ بیٹھتے تھے۔[1]

مرزا دبیرؔ کے اساتیذ:

مرزا دبیر نے علوم وفنونِ عقلیہ و نقلیہ مولوی غلام ضامن مرحوم سے اور علوم دینیہ مولانا مرزا کاظم علی صاحب سے حاصل کیے۔ اس سلسلے میں مولوی صفدر حسین تحریر کرتے ہیں:

''در ابتدای شباب جمله فنون عقلیه و نقلیه از کتب ادبیه و حکمیه و منطق و صرف و نحو وغیره در خدمت عالم کامل

۱۔ فکر بلیغ، ص ۱۶۵

فاضل آگاه دل قدوة العلماء الاعلام نخبة الفضلاء الاکرام مولوی غلام ضامن مرحوم اخذ کرده و علوم دینیه مثل فقه و اصول فقه و حدیث و تفسیر و کلام و ما یتعلق بها در صحبت با برکت جناب مستطاب جامع معقول و منقول حاوی فروغ و اصول طالب حق میرزا کاظم علی طاب ثراه و جعل الجنة مثواه **تحصیل نموده''.** [1]

''کتاب نما'' کے خصوصی شمارے مرزا دبیر نمبر کے صفحہ/۵۱ پر ۲۰۱۱ء میں سبط محمد نقوی کا ایک مضمون بعنوان ''مرزا دبیر کے دو استاذ'' شائع ہوا ہے۔ جس میں محترم نے مولانا مرزا کاظم علی صاحب اور مولانا مہدی مازندرانی کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اسی سے ماخوذ چند نکات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

''مولانا مرزا کاظم علی کا سال ولادت اور سال وفات نیز سن مبارک کا کوئی علم نہیں جو معلوم ہو سکا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ لکھنو کے امراء و روساء میں تھے۔ جناب غفرانمآب مولوی سید دلدار حسین کے اولین تلامذہ میں تھے۔ علم و فضل اور زہد میں بہت بلند تھے۔ آپ کے فرزند اکبر فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق کے بیان میں ڈاکٹر سید سلیمان حسین کا فرمانا ہے کہ ان کے زہد و تقویٰ کی بدولت ہی صالح، ان کے لقب یا نام کا جز بن گیا تھا''۔ [2]

سید مہدی فیض آبادی نے تذکرۃ العلماء میں تحریر کیا ہے:

''تلامذۂ غفرانمآب میں ایک تھے جناب معلٰی القاب، عالم علوم دینیہ، محقق تحریر، مدقق بے نظیر، جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول جناب مرزا کاظم علی مرحوم جو حد درجہ سلیم الطبع تھے اور تیزی ذہن و ذکا میں بلند مرتبے پر فائز تھے۔ آپ دودمان ریاست و خاندانی امارت سے تعلق رکھتے تھے۔ مسائل دینیہ کی فیض رسانی اور تعلیم فقہ اور اصول میں مشغول رہتے تھے۔ صلاح و تقدس میں علماء زمانہ کے سرکردہ تھے''۔ [3]

۱۔ شمس الضحیٰ، ص ۱۳۴/۱۳۵ ۲۔ لکھنو کے چند نامور شعراء، ص/۹۶ ۳۔ تذکرۃ العلماء، ص ۵۰

ثابت لکھنوی نے کسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا کو اخباری لکھ دیا ہے لیکن مندرجہ بالا اقتباس سے ثابت ہے کہ مولانا اصولی شیعہ اور اخباریت کے سخت خلاف تھے۔ غرض کہ مرزا کے دونوں استادوں نے اپنی اپنی صلاحیت اور علم کے ذریعے سلامت علی کو دبیر بنانے کا کام انجام دیا۔ جسے بعد میں میر ضمیر نے مزید جلا بخشی۔

شیخ ناسخ نے مرزا کاظم علی کی تاریخ وفات موزوں کی ہے:

علامه عصر زين جهان رفت　　زين دشت به گلشن جنان رفت

مرزا كاظم على ست اسمش　　چون روح لطيف بود جسمش

او عاشق آلِ مصطفى بود　　او عاشق صادق رضا بود

جان از تن او بطوس رفته　　يعنى پى پاى بوس رفته

علم فقه و حديث و قرآن　　شد ختم بران معلق ايمان

تاريخ وفات آن محقق　　جستم ز طبيعت مدقق

آواز آمد ز چرخ اطلس

"وى رفت به مشهد مقدس"

۱۲۴۹[۱]

صدمات اور عمر کے آخری لمحات:

عمر کے آخری ایام میں مرزا دبیر کچھ ایسے صدمات سے دوچار ہوئے کہ جنہوں نے مرزا صاحب کو نہایت کمزور کر دیا۔ ان کے جوان بیٹے کی موت، اس کے بعد بڑے بھائی کا انتقال اور پھر ان کے برادر ایمانی میر انیس کا سانحہ ارتحال یہ ایسے سانحے تھے جن سے باہر نکلنا دبیر کے لئے ممکن نہ تھا انہیں صدموں نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ صاحب حیات دبیر نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے:

''مرنے سے دو سال قبل مرزا صاحب کو چند صدمے روحانی بہت سخت پہنچے۔ پہلا صدمہ محمد ہادی عطارد تخلص نو جوان فرزند کا مرنا، جو ۵؍ شعبان

۱۔ دیوان ناسخ، حصہ ۲، ص ۲۰۴

المعظم ۱۲۷۱ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ عین شباب کے عالم ۲۰ برس کی عمر میں جمادی الاول ۱۲۹۰ھ کی پانچویں کو یکا یک تکمہ کر کے انتقال کر گئے۔ دوسرا صدمہ روحانی حقیقی بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر مرحوم کے مرنے کا تھا۔ جو اٹھائیسویں صفر المظفر ۱۲۹۱ھ کو آخرت کا سفر کر گئے۔ تیسرا صدمہ جوان دونوں صدموں سے بڑھ کر کاہش جان ہوا وہ بروز دوشنبہ ۲۹ شوال المکرّم ۱۲۹۱ھ کو قریب مغرب میر ببر علی صاحب انیس مرحوم کا مرنا تھا۔ یہ شیر نیستان سخن کیا مر گیا مرزا صاحب کی شاعری ہی نہیں زندگی کا مزہ جاتا رہا''۔ ۱؎

وفات دبیر:

میر انیس کی وفات سے مرزا دبیر کو بہت صدمہ پہنچا یہی وجہ ہے کہ میر انیس کے بعد مرزا صاحب بمشکل تین مہینے زندہ رہے۔ ثابت لکھنوی کی زبانی مرزا دبیر کی وفات کا حال سنئے:

> ''میر انیس مرحوم کے مرنے کے بعد مرزا صاحب مرحوم تین مہینے اور ایک دن زندہ رہے۔ مگر برابر علیل رہے۔ امام باندی بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد کے اصرار سے محرم الحرام ۱۲۹۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے۔ مگر عشرۂ محرم میں روز مجلس جناب اوج مدظلہ پڑھتے تھے۔ مرزا دبیر مرحوم مجلس میں بیٹھے رہتے تھے کہ علیل تھے۔ کچھ سادات و مومنین دور دور بستیوں سے اپنی اپنی بستیوں کی عشرہ محرم کی مجلسوں کو چھوڑ کو محض مرزا صاحب مرحوم کے سننے کو آئے تھے۔ آخری نویں محرم بعض مومنین نے افسوس کے لہجے میں عرض کیا کہ ہم حضور کے سننے کو آئے تھے اپنے گھر کی مجلسیں بھی چھوڑیں اور حضور کو نہ سنا یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ حضور علیل ہیں۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ انشاء اللہ آج میں پڑھونگا جتنا پڑھا جائیگا خدا جانے پھر عشرۂ محرم نصیب ہو یا

۱۔ حیات دبیر، ص ۱۰۶/۱۰۷

نہ ہو۔ جناب اوج کے بعد مرزا صاحب منبر پر تشریف لے گئے چند رباعیاں پڑھ کر چند بند بین کے پڑھے۔ ایسی رقت ہوئی کہ اکثر آدمی بیہوش ہو گئے۔طاقت خود سے اترنے کی نہ تھی لوگوں نے پکڑ کر منبر سے اتارا۔ بعد سویم ۱۲/محرم الحرام ۱۲۹۲ھ ایک ایک دو دو روز بمقام آرہ و حسین گنج قیام کرتے ہوئے لکھنو میں تشریف لائے۔''ورم کبد'' کی شدت تھی علاج ہوتا رہا مگر مرض الموت کا کیا علاج۔آخر اسی عارضہ ''ورم کبد'' میں ۳۰ محرم الحرام کی رات میں قریب قریب صبح صادق یہ آفتاب شاعری و مداحی غروب ہو گیا۔دن میں جنازہ اٹھا۔ دریا پر غسل میت کے واسطے جنازہ لیکر گئے۔ ہزاروں آدمی جنازے کے ساتھ علما وصلحا وشعرا تھے۔جناب سید ابراہیم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے گھر پر دفن ہوئے۔ جو چھوٹا سا مقبرہ اب تک برقرار ہے''۔[1]

تاریخ رحلت دبیرؔ:

مرزا دبیرؔ کی موت کا رنج صرف اپنوں ہی پر نہیں بلکہ غیروں پر بھی شاق گزرا۔اکثر شعرا نے تاریخ وفات کہیں۔

﴿قطعہ تاریخ از مرزا اوجؔ﴾

خاک بر سر کن صبا در ماتم سلطان نظم
حیف شد برباد اقلیم بلاغت بی دبیر
بنگر اندر بوستان هر نخل نخل ماتم ست
در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بی دبیر
مصرع تاریخ فوتش منشی گردوں نوشت
''آسمان بی مهر و دیهیم فصاحت بی دبیر''

۱۲۹۲ھ[2]

۱۔حیات دبیر، ص د۱۲۸/۱۲۹ ۲۔ایضاً، ص۱۳۰

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی تاریخ وفات ثابت لکھنوی نے بھی نظم کی ہے اور خاص طور اسی انداز میں اسی بحر میں نظم کی ہے جس زمین میں مرزا دبیرؔ نے میر انیسؔ کی تاریخ وفات نکالی تھی۔

﴿ تاریخ وفات از ثابت لکھنوی ﴾

آسمان بی ماه تابان سدره بی روح الامین ۱۲۹۲ھ

طور بی موسی ادب بی شمع منبر بی دبیرؔ ۱۲۹۲ھ [1]

انتخاب منیر شکوہ آبادی میں بھی دبیرؔ کی تاریخ رحلت شامل ہے اس کے کچھ اشعار بطور نمونہ شامل ہیں:

اوخ اوخ کاسمان بنشاند علم و فضل را
در غرای آفتاب کشور دانش دبیرؔ
بی قدومش بزم ماتم بی نگاهش مرثیه
گوئیه مصراست بی یوسف فلک بی ماه و تیر
گفت تاریخ وفاتش را منیرؔ اشکبار
"عقل بیدل سدره بی جبریل منبر بی دبیرؔ"
۱۲۹۲ھ [2]

آغا حجو شرف نے میر انیس و مرزا دبیر دونوں کی تاریخ وفات ایک ہی قطعہ میں ایک ہی مصرع میں پیش کی ہے:

آنکھوں میں میرے ہیں یہ آنسو بھرے ہوئے
لکھتا ہوں واقعہ میں انیسؔ و دبیرؔ کا
روز ازل سے عالم ایجاد میں پتا
ان کی نظیر کا ہے نہ ان کی نظیر کا
آخر غم انیسؔ میں بیدم ہوئے دبیرؔ
غم ہی صفیر نے یہ کیا ہم صفیر کا

ا۔ حیات دبیر، ص ۱۳۱ ۲۔ انتخاب منیر شکوہ آبادی، ص ۹۴، ۹۵

جانے کو بارگاہ خدا و رسول میں
بخشا لقب حسین نے ان کو سفیر کا
دو داغ دونوں کے سن رحلت میں اے شرف
''ہے ہے غم انیس'' میں ''غم ہے دبیر کا'' [1]

۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ھ

ان شعراء کے علاوہ ثابت لکھنوی نے سید احمد حسین فرقانی کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ ان کی قطعہ تاریخ فارسی زبان میں ۱۰۷/اشعار پر مشتمل ہے چند اشعار شامل کئے جا رہے ہیں:

خضر چنین گفت بمرگ دبیر
حضر بسر چشمه احسان رسید ۱۲۹۲ھ
گفت امام فصحای عرب
مور فصاحت بسلیمان رسید ۱۲۹۲ھ
زو نفس الیاس و چه نیکو نفس
تن بهرم روح بجانان رسید ۱۲۹۲ھ
گلشن فردوس چنین داد بوی
شیفته جان بلبل جانان رسید ۱۲۹۲ھ
وان قلم تعزیتش سفت دُر
بر علم شاه شهیدان رسید ۱۲۹۲ھ
نیز ز فرقانی فانی شنو
عاشق صادق بر سلطان رسید [2] ۱۲۹۲ھ

ا۔ دیوان آغا حجو شرف، ص۳۶۳ ۲۔ حیات دبیر، ص۱۳۱، ۱۳۲

رباعیات

رباعی اصناف سخن میں وہ مشکل ترین صنف ہے جس میں اکثر مشہور و معروف شعراء جولانی طبع دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ حالانکہ اکثر شعراء نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ رباعی کی ایجاد ''رودکی سمرقندی'' سے ہونے کے باوجود اس صنف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کرنے والے شعرا کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے جب کہ غزل، قصیدہ و مثنوی کہنے والے شعرا ہر دور میں کثرت سے موجود رہے ہیں۔ رودکی کے بعد رباعی میں عمر خیام نے اپنی فکر و تخیل سے وہ گوہر آبدار رباعی کے قالب میں ڈھالے کہ رباعی ہی خیام کی اصل وجہ شہرت بن گئی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی اکثر زبانوں میں خیام کی رباعیات کا ترجمہ کیا گیا اور انگلینڈ کے شاعر فیٹز جیرالڈ نے انگریزی زبان میں ان رباعیات کا ایسا ترجمہ پیش کیا کہ خیام کی فکر مشرق سے زیادہ مغرب میں کارآمد ثابت ہوئی۔ حالانکہ محققین نے لکھا ہے کہ'' خیام اپنے علمی مشاغل سے تھک کر اپنے دماغ کو رباعی کہہ کر تر و تازہ کیا کرتا تھا''؟ اگر اس مقولہ کی حقیقت کو تسلیم کیا جائے تو یہ امر قابل غور ہے کہ جب خیام اپنی تمام تر توجہات رباعی گوئی میں صرف نہیں کرتا تھا تب اس کی رباعیات کا یہ عالم ہے اور اگر وہ دیگر شعراء کی طرح باقاعدہ رباعی گوئی پر توجہ دیتا تو اس کی رباعیات کا معیار کیا ہوتا! خیر جو بھی ہے خیام نے رباعی گوئی کو ایک پہچان عطا کی اور ادب میں اس کا مقام بلند کیا۔

ایران کے دیگر متاخر شعراء نے متقدمین کی طرح اس صنف میں کم ہی طبع آزمائی کی ہے اور خیام کے بعد کوئی بڑا نام باقاعدہ طور پر رباعی گو کا نظر نہیں آتا۔ برصغیر ہند میں بھی اس صنف

سخن پر کم طبع آزمائی کی گئی۔اسی لیے مسعود سعد سلمان جیسے با کمال رباعی گوشاعر کم نظر آتے ہیں۔لیکن سرمد شہید نے ہندوستان میں خیام جیسی شہرت حاصل کی۔

رباعی عربی لفظ ربع سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چار/۴، چونکہ اس صنف میں چار مصرعے ہوتے ہیں لہذا اسے رباعی کہا جاتا ہے۔ رباعی چار مصرعوں میں محدود ہے لہذا شاعر کو ایسے مضمون کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جسے وہ چار مصرعوں میں بخوبی ادا کر سکے۔ رباعی کا چوتھا مصرع رباعی کی جان ہوتا ہے جتنا پر مغز، فصیح و بلیغ، بہتر اور دلکش چوتھا مصرع ہوگا اتنی ہی رباعی کی افادیت رہے گی۔

دوبیتی، ترانہ اور چہار مصرعہ وغیرہ رباعی سے مختلف اصناف ہیں۔ فارسی شعر و ادب میں رباعی کا شمار ان اصناف سخن میں کیا جاتا ہے جو اہل فارسی کی اپنی اختراع ہیں۔کچھ محققین اس کے عربی نام ہونے کی بنا پر اس غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں کہ یہ صنف بھی عرب کی دین ہے۔محققین نے رباعی کے حوالے سے مدلل گفتگو کی ہے۔مثلاً شمس قیس رازی لکھتے ہیں:

"زحافی که درین مستعمل است در اشعار عرب نه بوده است"[1]

نجم الغنی لکھتے ہیں:

''عرب میں رباعی کا دستور نہ تھا یہ شعرائے عجم نے بحر ہزج سے نکالی ہے''۔[2]

مندرجہ بالا محققین کے علاوہ بھی دیگر نے اس سلسلے میں کافی تحقیق کی ہے۔معروف محقق و ماہر رباعی پروفیسر عراق رضا زیدی نے اس سلسلے میں اشتباہ کے وجود پانے کی وجہ کے ساتھ اس امر پر مفصل و مدلل گفتگو کر کے اس اشتباہ کا ازالہ فرمایا ہے۔ یہاں ہم استاد محترم کی اسی مفصل بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

''عربی میں 'دوبیتی' کا سوال اس لئے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ لفظ 'دو' کا شمار صرف فارسی یا ہندی میں ہے عربی میں نہیں اس کے علاوہ مثنوی اور رباعی وہ اصناف سخن ہیں جو خالص ایرانی یا فارسی ہیں ورنہ سبھی اصناف سخن عربی زبان سے ہیں جو فارسی زبان میں در آئی

۱۔المعجم فی معایر اشعار العجم ص ۲۱۱۵۔بحر الفصاحت، ج ۱ص ۳۵۸

ہیں۔ جب لفظ 'دو' فارسی زبان کا ہے تو عربی میں 'دوبیتی' کا رواج افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اس لئے یہ پورا قول صداقت سے دور ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سلیمان ندوی کے اس قول نے بھی شبہ پیدا کیا جو مرحوم نے قول، غزل، ترانہ، دوبیتی اور رباعی کے بارے میں "**المعجم فی معاییر اشعار العجم**" کے حوالے سے تحریر کیا ہے اس کتاب کے صفحہ ۲۲ پر تحریر ہے۔ "**آن را رباعی خوانند از بهر آنکه بحر هزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمده است پس هر بیت ازین وزن دو بیت عربی باشد**"۔ یہاں دوبیت عربی کا مفہوم عربی زبان کی دوبیتی نہیں ہے بلکہ عربی کے دوشعر مراد لیے گئے ہیں یہ بات دوسرے جملے سے اور واضح ہو جاتی ہے جو اس بحث میں شامل نہیں کیا گیا اور مسلسل ہے۔ "**لکن بحکم آنکه زحافی که درین وزن مستعمل است در اشعار عرب نبوده است در قدیم برین وزن شعر تازی نگفته اند**"۔ اس عبارت سے ثابت ہے کہ عربی زبان میں اگر رباعی کہی بھی گئی ہے تو فارسی رباعی کے بعد کہی گئی ہے پہلے نہیں' ۔[1]

الغرض رباعی فارسی کی دین ہے نا کہ عربی کی۔ اور چونکہ رباعی کی اپنی ہیئت ہے لہذا رباعی گوئی کی ہمیشہ ایک الگ پہچان اور اہمیت رہی ہے۔ جس کی وجہ، رباعی کا ایک خاص بحر اور اس کے چوبیس اوزان میں لکھا جانا ہے۔ رباعی کی ہیئت ابتدا ہی سے دو حصوں میں منقسم رہی ہے۔ پہلی صورت چاروں مصرعوں میں قوافی اور ردیف کا استعمال کرنا۔ جسے سالم رباعی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری صورت پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قوافی اور ردیف کا استعمال کر کے تیسرے مصرعے کو ردیف و قافیے سے آزاد کر دینا۔ اس طرح کی رباعی کو غیر

ا۔ جلال الدین رضا اور ان کی رباعیات، ص ۲

سالم یا خصی رباعی کہا جاتا ہے۔ تیسرے مصرعے کو قافیہ۔ ردیف سے آزاد رکھنے پر جہاں مضمون آفرینی میں آسانی ہوتی ہے وہیں بندش سے آزاد ہو کر کسی بات کو اور اچھے پیرایے میں کہنے کی آزادی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ عام طور سے اسی طرح کی رباعی کا رواج رہا ہے۔

رباعی شاعری کی ایسی مشکل صنف ہے جس کے علاوہ ہر صنف سخن پر علم عروض سے ناواقفیت کے بعد بھی طبع آزمائی کی جا سکتی ہے لیکن رباعی کہنے کے لئے شاعری کے تمام رموز سے واقف ہونا لازمی ہے۔ رباعی کے لئے بحر ہزج مخصوص ہے جس کے ۲۴ اوزان مروج رہے ہیں لیکن بقول استاد محترم پروفیسر عراق رضا زیدی رودکی سے قاآنی تک کسی شاعر نے بھی ۱۵ سے زیادہ اوزان استعمال نہیں کئے ہیں۔ عام طور پر عروضیوں نے رُباعی کے ۲۴ اوزان بتائے ہیں۔ دورِ حاضر میں استاد زار علامی اور ان کے استاد سحر عشق آبادی نے ۵۴ ر اوزان کی نشان دہی کی ہے جو رائج نہ ہو سکے۔

رباعی اور اوزان رباعی کی ابتدا کے سلسلے میں یہ وضاحت ملتی ہیں۔

کتاب'' **المعجم فی معاییر اشعار العجم**'' میں شمس الدین محمد بن قیس رازی جو ساتویں صدی ہجری کے ربع اول کے مصنف ہیں لکھتے ہیں کہ متقدمین شعرائے عجم میں ایک شاعر نے اخرم اور اخرب کے اجتماع سے نیا وزن نکالا جس کو وزن رباعی کہا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> **"یکی از متقدمان شعرای عجم و پندارم رودکی والله اعلم از نوع اخرم و اخرب این بحر وزنی تخریج کرده است که آن را وزن رباعی خوانند، الحق وزنی مقبول وشعری مستلذ و مطبوع است و از این جهت اغلب نفوس نفیس را بدان رغبت است و بیشتر طباع سلیم را بدان میل، وگویند سبب استخراج این وزن آن بوده است که روزی از ایام اعیاد بر سبیل تماشا در بعض از**

متنزهات غزنین طایفه ای اهل طبع را دید کرد ملعبه جعمی کودکان ایستاده و دیده بنظاره کوزبازی کودکی نهاده از آنجا که شطارت جوانان شاعر و بطالت شاعران شاطر باشد قدم در نهاد و سر بمیان ایشان بر آورد کودکی دید ده پانزده ساله با زلف و عارضی چون سنبل ببرامن لاله ؎

بقد چون سرو بلند و برخ جو بدر منیر
بخلق روح مجسم بخلق مشک و عبیر

منظری دلکشای و مخبری جان فزای گفتاری ملیح و زبانی فصیح طبعی موزون و حرکاتی مطبوع مردم در جمال و کمالش حیران مانده و او بلطف طبع آن نقش باز خوانده بهر کرشمه صد دل می خست و بهر نکته ده بذله در می نشاند بشیوه کری جان شکری می کرد و درکوز بازی اسجاع متوازن و متوازی می گفت در آمد شد تمایلی می کرد و درگفت و شنود شمایلی می نمود کردکانی چند از کف بکوی می انداخت و در خفض رفع خوذ را از اشارت مردم غافل می ساخت شاعر در آن لباقت خلق و ذلاقت نطق حیران مانده و انگشت تعجب در دندان گرفته بر آن تناسب اعضا آفرین و تحسین می کرد و بر آن صورت زیبا معوذتین و یسین می خواند، تا یکباری در انداختن کردکانی از کو (کوز) بیرون افتاد و بقهقری هم بجایگاه باز

غلطید کودک از سر ذکای طبع و صفای قریحت گفت:

غلتان غلتان همی رود تا بُن کو

شاعر را این کلمات وزنی مقبول و نظمی مطبوع آمد

بقوانین عروض مراجعت کرد و آن را از مخترعات

بحر هزج بیرون آورد ۱؎

رباعی کے وزن کے سلسلے میں پروفیسر عراق زیدی نے اپنی تازہ تصنیف ''محبوب رباعیات'' میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''رباعی کی تاریخ پر یوں تو بہت سی کتابیں، اقوال اور بحثیں سامنے آتی رہی ہیں۔ لیکن راقم نے فارسی رباعی کا موجد و بانی رودکی کو ہی مانا ہے اور دوسرا شاعر ابوشکور بلخی ہے۔ جہاں تک دو بیتی یا آہنگ کے پہلے سے موجود ہونے کی بات کہی جاتی ہے تو اس میں بھی کوئی جان نظر نہیں آتی۔ کیونکہ رباعی کا سب سے قریبی آہنگ ''**مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن**'' ہے۔ اس وزن میں حافظ اور غالب دونوں کی خاصی غزلیں موجود ہیں۔ اس وزن سے اگر صرف آخری ''ن''، یعنی آخری رکن ''**فعولن**'' سے ''ن'' الگ کر دیں اور اسے صرف ''**فعول**'' پڑھیں تو یہ وزن اس طرح ہو جائیگا ''**مفعول مفاعیل مفاعیل فعول**'' اور یہی وزن رباعی کا ہے۔ اب اس سے قریبی آہنگ اور کیا ہو سکتا ہے لیکن یہ وزن بھی رباعی کے وزن سے کوسوں دور کا وزن ہے۔ گویا رباعی کا وزن ایک حرف بھی زائد ہونے کو برداشت نہیں کر سکتا تو پہلے سے رائج کوئی بھی آہنگ رباعی کے وزن سے میل نہیں کھاتا''۔ ۲؎

رباعی کے موضوع عموماً عشقیہ، فلسفیانہ، اعتقادی، مذہبی، عرفانی اور اخلاقی ہوتے ہیں۔

۱۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم ص ۱۱۲، ۱۱۳ ۲۔ مقدمہ محبوب رباعیات، ص ۱۲، ۱۳

فارسی کے عظیم رباعی گو شاعر ابوسعید ابوالخیر اور خواجہ فرید الدین عطار وغیرہ کی رباعیات کے موضوع اخلاقی اور عرفانی ہیں ۔لہذا مرزا دبیرؔ کی رباعیات کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی رباعیات کے موضوعات بھی اخلاقی ،عرفانی اور رثائی ہیں۔جن میں جداگانہ اوزان کا استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے ''رباعیات دبیر'' کے عنوان سے مجموعہ رباعیات شائع کیا ہے اس میں رباعیات کی تعداد تیرہ سو انتالیس (۱۳۳۹) تحریر کی ہے اور ان میں ۳۵ رباعیات فارسی کی بیان کی ہیں اور وہی فارسی رباعیات ''مصحف فارسی'' میں شامل کی ہیں۔ان ۳۵ رباعیات میں سے آخری پانچ، رباعی کی ہیئت سے باہر ہیں ان کا وزن بحر ہزج نہیں ہے اس کلام کو رباعی کا نام نہ دے کر قطعہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔اس کے علاوہ ان رباعیات میں ترتیب وار ساتویں نمبر پر موجود کلام وزن رباعی میں تو ہے لیکن رباعی کی اصل شرط قافیہ سے خالی ہے لہذا اس کو بھی رباعی کے زمرے میں نہ رکھ کر قطعہ ہی کہا جائیگا۔ان چھ قطعات کو نکال کر بقیہ ۲۹ رباعیات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے باقی کلام پر قطعات کے ذیل میں گفتگو کی جائیگی۔

نواسۂ رسول اکرمؐ حضرت امام حسینؑ کی ذات والا صفات پر اکثر علماء، فضلاء، صوفیاء اور شعراء نے گفتگو کی ہے۔اب وہ چاہے عطار، سنائی غالب یا اقبال ہوں ۔سب نے آپ کی قربانی و جانثاری کو موضوع سخن بنایا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کی تخلیق کردہ رباعی''**شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسین**'' شہرہ آفاق کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ جس میں خواجہ غریب نواز نے بے مثل فنکاری دکھاتے ہوئے مختلف صنعتوں سے استفادہ کر کے حسن پیدا کیا ہے۔مثلاً کسی ایک مصرع میں ایک قبیلہ کے لفظ رکھنا معیوب مانا جاتا ہے لیکن خواجہ صاحب نے مصرعہ اولی و ثانی دونوں میں ایک ہی قبیلے کے دو الفاظ کا استعمال کیا ہے ۔مصرعہ اول میں شاہ اور بادشاہ، مصرعہ ثانی میں دین اور دین پناہ کا استعمال کیا ہے۔لیکن الفاظ کے معنی پر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ کے جداگانہ معنی ہیں لہذا ان الفاظ کے استعمال نے عیب کی بجائے حسن پیدا کیا ہے اور مفہوم کی ادائیگی میں آسانی کی ہے۔ یہ رباعی

آج بھی آپ کی درگاہ کے صدر دروازے کی جبین پر زرین جھومر کی طرح نقش ہے۔اس رباعی کے اتباع میں اکثر اردو شعراء نے زور آزمائی کی ہے۔

الغرض امام حسینؑ کی ذات کے حوالے سے منظوم و منثور گفتگو کرنا باعث فخر وثواب مانا جاتا ہے۔مرزا دبیر نے بھی فارسی رباعی کے لئے انہیں مضامین کا انتخاب کیا ہے۔اور ان موتیوں کو شعر کی لڑی میں پروکر اس طرح ادا کیا:

در کوچه عشق بود کامل شبیرؑ
بر دوست نثار بود از دل شبیرؑ
آن جلوه که دیده بود موسی بر طور
می دید به زیر تیغ قاتل شبیرؑ[۱]

مذکورہ رباعی کے تیسرے مصرعے میں قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ کے لئے نازل ہوئی تھی:

> **''قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی فلما تجلی ربه للجبل جعله دکاً وّ خرا موسی صعقاً فلما افاق قال سبحانک تبت الیک و انا اول المومنین''.** خدا نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھو ہم اس پر اپنی تجلی ڈالتے ہیں پس اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے تو سمجھنا کہ عنقریب مجھے بھی دیکھ لوگے ورنہ نہیں۔ پھر جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو چکنا چور کر دیا اور موسی بے ہوش ہوکر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے خداوند تو دیکھنے دکھانے سے پاک و پاکیزہ ہے میں نے تیری بارگاہ میں توبہ کی اور میں سب سے پہلے تیری عدم رویت کا یقین کرتا ہوں۔[۲]

۱۔مصحف فارسی، ص۴۶ ۲۔اعراف آیت ۱۴۳

مولانا جلال الدین رومی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''مثنوی معنوی'' میں حضرت موسیٰ کے اس تاریخی واقعہ کو موزوں کیا ہے:

عشق جان طور آمد عاشقا

طور مست و خر موسی صاعقا ۱؎

مرزا دبیرؔ نے حضرت امام حسینؑ کا خداوند عالم سے عشق اور اس کی راہ میں قربانی کا ذکر کیا ہے۔ عشق کی اس منزل کا ذکر کیا ہے جہاں عاشق کو صرف معشوق نظر آتا ہے اس کے علاوہ دنیا کی کوئی شی نظر نہیں آتی اب چاہے وہ خنجر قاتل ہو یا نوک نیزہ۔ اسی لیے جو جلوہ حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر جا کر میسر ہوا حضرت شبیرؑ اس کا مشاہدہ زیر خنجر کر رہے ہیں۔ امام حسین نے عشق الٰہی میں اپنی جان قربان کی۔ حافظ شیرازی نے ایسے ہی عشق کے لئے کہا ہے:

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق

ثبت است بر جریده عالم دوام ما ۲؎

یعنی جس نے اپنے دل میں عشق کو بسا لیا جو عشق میں مٹ گیا وہ سمجھو کائنات میں زندہ جاوید ہو گیا تا قیامت اس کے عشق کا قصہ بیان ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔
اسی طرح کا مضمون حافظؔ شیرازی نے دوسری غزل میں بھی موزوں کیا ہے:

راهیست راه عشق که هیچس کناره نیست

آنجا جز آن که جان بسپارند چاره نیست ۳؎

جس نے عشق کو اپنی منزل بنا لیا اس کے لئے جان دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ امام حسینؑ نے بھی یہی کیا کہ اپنے محبوب کی چاہت میں جان قربان کر دی۔

ایسا لگتا ہے کہ علامہ اقبال نے واقعہ کربلا اور اصحاب حسینی کی غیرت و خودداری کو سامنے رکھ کر ''اسرار خودی'' کا یہ شعر نظم کیا ہے جو مذکورہ رباعی میں نظر آتا ہے کہ آپ کو زیر خنجر بھی جلوہ محبوب نظر آ رہا ہے علامہ اقبال نے کچھ یہی مفہوم ادا کیا ہے کہ عشق میں خنجر و تلوار کا کوئی ڈر نہیں رہتا ملاحظہ ہو:

۱۔ مثنوی معنوی مولوی، دفتر اول   ۲۔ دیوان حافظ غزل نمبر ۱۱   ۳۔ دیوان حافظ غزل نمبر ۲۷

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست[1]

مشائخ نے جو عشق الٰہی کے مدارج بیان کئے ہیں ان میں عشق ایک اہم منزل ہے جہاں صرف اور صرف معشوق نظر آتا ہے۔ مرزا دبیر نے بھی ایسے مضامین سے اپنی رباعیات کو ابدیت بخشی ہے۔

بر ظلم تو سینہ نبیؐ چاک گواہ
وان شاہ فلک فتادہ بر خاک گواہ
ماندی بعثت کہ غایتت گشت تلف
لولاک لما خلقت الافلاک گواہ[2]

حضور اکرمؐ کو اپنے چھوٹے نواسے امام حسینؑ سے جتنی محبت تھی اس کی مثالیں دنیا میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ کتب احادیث میں مرسل اعظم کی یہ مشہور و معروف حدیث موجود ہے:

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہ و آلِہِ سَلَّمَ : حُسَینُ مِنِّی وَانَا مِن حُسَینٍ اَحَبَّ اللّٰہ مَن اَحَبَّ حُسَینا حُسینُ سبط مِنَ الْاسبَاط۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: میرا حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں، خدا اسے محبوب رکھتا ہے جو حسین سے محبت کرتا ہے حسین میرا نواسہ ہے۔[3]

کتاب ارجح المطالب میں مندرج ہے:

''صحابی رسول ابو ہریرہ راوی حدیث کا بیان ہے میں نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا ہے کہ رسول کریم لیٹے ہوئے ہیں اور امام حسینؑ نہایت کمسنی کے عالم میں ان کے سینہ مبارک پر ہیں ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑے ہوئے فرماتے ہیں اے حسینؑ تو میرے سینے پر کود۔ چنانچہ امام حسینؑ آپ کے سینہ مبارک پر کودنے

۱۔ اسرار خودی، کلیات اقبال ۲۔ مصحف فارسی، ص ۴۷ ۳۔ رواۃ الترمذی 3775، وابن ماجہ 144

لگے اس کے بعد حضور صلعمؐ نے امام حسینؑ کا منہ چوم کر خدا کی بارگاہ
میں عرض کی اے میرے پالنے والے میں اسے بے حد چاہتا ہوں
تو بھی اسے محبوب رکھ''۔[1]

کشف المحجوب میں شیخ علی ہجویری نے واقعہ نقل کیا ہے:

''چنانکه عمر بن الخطابؓ روایت کند: روزی بنزدیک پیغمبر علیه السلام اندر آمدم.وی را دیدم حسینؑ را بر پشت خود افگنده بودو رشته ای اندر دهان خود گرفته و سر رشته به دست حسین داده؛ تا حسین می رفت و وی علیه السلام از پس حسین به زانوها می رفت. من چون آن بدیدم گفتم : نعم الجملُ جملک یا ابا عبد الله، پیغمبرؐ گفت:علیه السلام: نعم الراکب هو یا عمر ''[2]

رسول اکرمؐ کو اپنے نواسے سے اتنی محبت اس لئے ہے کہ اسی نواسے نے آپ کے لائے ہوئے دین کو بچانے کے لیے اپنے پورے خاندان کی قربانی پیش کی تھی۔ مرزا دبیر نے تیسرے اور چوتھے مصرعے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے اگر امام حسینؑ اپنی قربانی پیش نہ کرتے تو حضورؐ کی بعثت کا مقصد تلف ہو جاتا۔ جتنی محنت و مشقت سے آپ نے عرب کے باشندوں کو انسان بنایا وہ سب دوبارہ سے اسی دیرینہ جہالت کی طرف پلٹ رہے تھے امام حسینؑ نے اپنی قربانی پیش کر کے ان کے مردہ ضمیروں کو حیات نوبخشی۔ اسی کے تحت مولانا محمد علی جوہر نے اپنی ایک غزل میں کہا تھا:

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید تھا
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد[3]

۱۔ ارجح المطالب ص ۳۹۵ ۲۔ کشف المحجوب، ص ۴۷ ۳۔ کلام جوہر، جوہر، ص ۶۱

صنعت ترصیع ایسی صنعت ہے جس کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے مذکورہ ذیل رباعی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انوکھی صنعت ترصیع کا نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔

جانم به فدای تو ابا عبد اللہؑ
نطقم به ثنای تو ابا عبد اللہؑ
با آن بی وفایی اهل ستم
کم شد نه وفای تو ابا عبد اللہؑ [1]

شمس قیس رازی نے صنعت ترصیع کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"ترصیع جواهر در نشاندن است و در صناعت سخن کلمات را مسجع گردانیدن والفاظ را در وزن و حروف خوانیم متساوی داشتن ترصیع خوانند. چنانک در قرآن مجید است. اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِی نَعِیم، وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِی جَحِیم". [2]

صنعت ترصیع کے بارے میں نجم الغنی خاں نجمی رامپوری کا خیال ہے۔

''صنعت ترصیع: یہ صنعت اس طرح ہے کہ ایک مصرع موزوں کریں اور اس کے مقابل دوسرا مصرع اس طریق پر لاویں کہ پہلے مصرع کا پہلا لفظ دوسرے مصرع کے پہلے لفظ کا قافیہ ہو اور پہلے مصرع کا دوسرا لفظ دوسرے مصرع کے دوسرے لفظ کا قافیہ ہو۔ اسی طرح پہلے مصرع کے اور الفاظ بھی ترتیب وار دوسرے مصرع کے الفاظ کا قافیہ ہوں''۔ [3]

اس رباعی کے مصرع اول و ثانی میں **جانم** اور **نطقم**، **فدای** اور **ثنای** ایک دوسرے کا قافیہ ہیں اور یہی اس صنعت کی خوبصورتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ دشمنوں کے ظلم وستم کرنے پر صبر کیا اور اپنے اخلاق حسنہ سے اہل عرب ہی کیا تمام

۱۔ مصحف فارسی، ص ۴۷ ۲۔ المعجم، ص ۳۳۵/۳۳۶ ۳۔ بحر الفصاحت ج ۲ ص ۱۲۸۴

اہل جہان کو متاثر کیا۔آپ کا اخلاق عالمین کے لیے سیرت ہے جو اس راہ پر گامزن ہو جائے اس کی دنیا و آخرت دونوں فلاح و بہبودی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ اسی آغوش کے پروردہ آپ کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؑ بھی انہیں اخلاق و اطوار سے آراستہ تھے۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمنوں کی ایذا رسانی کے باوجود کبھی حرف شکایت لب ہائے مبارک تک نہ آنے دیا اور اپنی تبلیغ میں مشغول رہے اسی طرح امام حسینؑ نے اعدا کی ایذا رسانی وظلم و جور کے باوجود شکوہ و شکایت نہ کی بلکہ ظالم کے ہر ستم پر اپنا سر شکر خالق میں خم کیے رکھا۔شاعر نے اسی مضمون کو نہایت خوبصورت پیرایہ میں ادا کیا ہے۔اہل ستم نے آپ کے ساتھ بے وفائی کی لیکن اس پیکر ایثار کی وفا میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی طرح امت کی بخشش کی دعا زیر خنجر بھی مانگتے رہے۔

در دشت حسینؑ خویش تنها می دید
مجروح هزار زخم اعضا می دید
می دید به نعش اقرباگهه گریان
لب تشنه گهی به سوی دریا می دید [۱]

امام حسینؑ جب گھر سے سفر پر نکلے تو ان کے عزیز، اقربا، اصحاب اور اکثر بنی ہاشم ساتھ تھے۔ رفقاء کی تعداد کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں لیکن ۷۲ شہداء کی روایت زیادہ مقبول ہے۔روز عاشورہ نماز ظہر کے بعد جنگ شروع ہوئی اور عصر تک تمام عزیز و احباب شہید ہو گئے اور نواسہ رسولؐ تن تنہا میدان میں رہ گئے۔مرزا دبیرؔ نے اسی منظر کو موزوں کیا ہے جس میں امام حسینؑ کی مظلومی وبیکسی بیان کی ہے۔امام حسینؑ اکیلے مقتل میں کھڑے ہیں ایک تن پر ہزاروں زخم ہیں۔ایک ایک کر کے سبھی عزیز و اقارب کے لاشوں کی طرف دیکھتے ہیں اور خود کو تنہا پاتے ہیں تو اپنے قوت بازو عباس علمدار کو سوئے دریا مخاطب کر کے اپنی بیکسی و بے چارگی بیان کرتے ہیں۔

۱۔رباعیات دبیر،ص ۱۰۶

میر انیس نے اپنے ایک مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' میں امام حسینؑ کے زخموں کی تعداد یوں نظم کی ہے:

انیس سو ہیں زخم تن چاک چاک پر
زینبؑ نکل حسینؑ تڑپتا ہے خاک پر ا؎

عشق نام ہے فنا کا قربانی کا ایثار کا۔ اپنی ہستی کو بھلا دینے کا یعنی جب عشق کا خمار ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے تو پھر ذہن میں معشوق رہتا ہے اس کی یادیں تازہ رہتی ہیں اس کی ہی باتیں رہتی ہیں۔ عاشق بس اسی تگ و دو میں رہتا ہے کہ کس طرح اپنے محبوب سے قریب تر ہو۔ کس طرح اپنے معشوق و مطلوب کی رضا حاصل کرے اسے خود سے راضی کرے کہ معشوق بھی کہہ اٹھے:

''**یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیه فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی**''. اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف پلٹ آ۔ اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہو۔ پھر میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔۲؎

یہی تو وہ جذبہ ہے وہ احساس ہے جو تین دن کی بھوک و پیاس میں بھی حسین اور ان کے اصحاب باوفا کو تقویت بخش رہا تھا۔ تبھی تو عالم تھا کہ پیشانی میں تیر کے باوجود سر سجدۂ خالق میں جھکا ہوا ہے جسے مرزا دبیر نے شعری پیرایہ میں موزوں کیا ہے:

تن ریش به سجده سر به پیشانی تیر
خنجر به گلوی خشک و بر لب تکبیر
بر سینه او نشسته شمر برای ذبح
نظاره کنان به نعش سرورؑ همشیر۳؎

خداوند کریم کبھی کسی بہن کو یہ منظر نہ دکھائے جو منظر شاعر نے بیان کیا ہے۔ کہ جس وقت امام

ا۔انتخاب از مراثی انیس، ص ۱۷۵ ۲۔سورہ فجر آیت ۲۷ تا ۳۰ ۳۔رباعیات دبیر، ص ۲۰۳

حسینؑ نے سجدہ خالق میں اپنا سر جھکایا تو ان کی کیفیت یہ تھی کہ تمام بدن میں تیر پیوست تھے بدن زخموں سے چور چور تھا اور سجدہ خالق میں اپنا سر جھکائے شکر خالق ادا کر رہے تھے۔ خیمے کے در پر کھڑی بہن زینب یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ شمر نے بہن کی آنکھوں کے سامنے بھائی کا سر تن سے جدا کیا۔ ایک بہن کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی صدمہ نہیں ہوسکتا۔

مقتل ابی مخنف میں ذکر شہادت امام حسین درج ہے جس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

> ''امام حسین نے کہا میرے جد رسول اکرمؐ نے درست کہا تھا۔ شمر نے پوچھا: تمہارے جد نے کیا کہا تھا۔ آپ نے فرمایا میں نے سنا کہ آپ میرے والد علیؑ سے فرما رہے تھے۔ اے علیؑ تمہارے بیٹے کو ایک مبروص ذبح کرے گا اس کی شکل کتے سے مشابہ ہوگی اور اس کے بال خنزیر کے مشابہ ہوں گے۔ یہ سن کر شمر نے کہا اچھا تمہارے جد نے مجھے کتے اور سور سے تشبیہ دی۔ اب میں تمہیں پس گردن سے ذبح کروں گا''۔[1]

کس تشنه دهن را ته خنجر نه کند
کس قتل نبیرۀ پیمبرؐ نه کند
ای شمر بدعوی مسلمانی تو
کاری کردی که هیچ اکفر نه کند [2]

رسول اور آل رسول علیہم السلام کا ادب و احترام ہر مسلمان ہر کلمہ گو پر لازم ہے۔ کسی بھی مذہب کا پیروکار اپنے مذہب کے رہبر و رہنما اور ان کے اہل و عیال کے ساتھ ایسے ظلم و ستم نہیں کرتے اور اگر ایسے ظلم کرتے ہیں تو وہ اس مذہب کے پیروکار نہیں ہو سکتے۔ مرزا دبیر نے اسی مسئلہ کو رباعی میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی بھی بھوکے پیاسے کو ذبح نہیں کرتا حتیٰ کہ اسلامی قانون یہ ہے کہ جانور کو بھی ذبح کرنے سے پہلے پانی پلا دیا جائے اور تب تک اس کے آگے سے پانی نہ ہٹایا جائے جب تک کہ وہ خود اپنا منہ نہ ہٹالے۔ یہاں تک کہ رسول کریم کا قول ہے۔

۱۔ مقتل ابی مخنف ص ۶۴ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۵

"لا تَضربوا الدَّواب علی وجوهها فانها تُسبِّح بحمدِ الله".

حیوان کو نہ مارو اس لئے کہ وہ خدا کی تسبیح و تحلیل کرتے ہیں۔ ۱؎

کوئی بھی دین اسلام کا پیروکار نواسہ رسولؐ کے ساتھ زیادتی برداشت نہیں کرے گا۔ رسول کو جب جانوروں کا بھی اتنا خیال ہے تو وہ اپنے نواسے کی اذیت کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اور جو اپنے رسول کی بات نہ مانے ان کے حکم کے خلاف عمل کرے وہ کس طرح مسلمان ہوسکتا ہے۔ اے شمر تو تو مسلمان ہونے کا دعوی کرتا ہے جب کہ تیرا عمل ایسا ہے کہ کوئی کافر بھی ایسا کرنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا۔

کس چون تو فلک به جور سر بر نکند
هم چون تو ستم گری ستم سر نکند
کس قتل نبیره پیغمبر نکند
کاری کردی که هیچ اکفر نکند ۲؎

اسلام و مسلمان ماخوذ ہے "السلم" سے جس کے معنی ہیں سلامتی یعنی اسلام و مسلمان کا مطلب ہے سلامتی، امن و امان، سکون و راحت۔ جیسا کہ اسلام کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ امن و امان کا دین ہے مذہب اسلام میں کسی کو بے جرم و خطا ستانا حرام ہے کسی کے مال پر قبضہ کرنا حرام ہے کسی نامحرم کو دیکھنا حرام ہے کسی جگہ پر قبضہ کر کے اس سے لڑنا حرام ہے کسی کی جگہ پر جا کر اسے بے جرم و خطا قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ یہ تمام امور اگر کسی عام انسان کے ساتھ انجام دیے جائیں تو حرام ہیں تو نبی کریمؐ اور ان کی آل پاک کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔

در نخل دو شاخ بارور داشت علیؑ
از باغ جهاں همیں ثمر داشت علیؑ
صد حیف که هر دو شاخ آں به بریدند
از گلبن آه هرچه برداشت علیؑ ۳؎

۱۔ الکافی: ۶/ ۵۳۸/۴، الخصال: ۶۱۸/ ۱۰ منتخب میزان الحکمۃ: ۱۷۰ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۶ ۳۔ ایضاً، ص ۶۰۷

ایک باپ کے لئے اس کا کل اثاثہ اس کی اولاد ہوتی ہے اور خاص طور پر بیٹے اس کی پیری کے سہارے، اس کے بڑھاپے کی لاٹھی ہوتے ہیں جو اس کا نام زندہ رکھتے ہیں اپنی لیاقت و قابلیت سے اپنے باپ کا نام روشن کرتے ہیں اور اگر وہ بیٹے حسنؑ و حسینؑ جیسے ہوں جن کو رسول کریمؐ اپنے بیٹے کہیں تو ان کی عظمت و فضیلت کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے دو صاحب زادے تھے جنہیں سبطین رسولؐ بھی کہا جاتا ہے حضرت حسنؑ اور حضرت حسین۔ دونوں کو ہی شہادت نصیب ہوئی ایک کو گھر میں زہر دغا سے شہید کیا گیا اور ایک کو غریب الوطنی میں خنجر جفا سے۔ مشہور مفکر اسلام اور قائد مسلک بریلوی مولانا احمد رضا خاں نے ان دونوں شہادتوں کو رسول خدا کی شہادت تسلیم کیا ہے اور ان دونوں کے جسم کو رسول خداؐ کے سایہ نہ ہونے سے تشبیہ دی ہے:

معدوم نہ تھا سایہ شاہ کونین
اس ذات کی جلوہ گاہ تھی ذات حسنینؑ
تمثیل نے اس نور کے دو ٹکڑے کیے
آدھے سے حسنؑ بنے ہیں آدھے سے حسینؑ [1]

مرزا دبیرؔ نے اسی مضمون کو اس خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہ جس مضمون کی ادائیگی کے لئے ۲۰۰ /دوسو سے زیادہ بند کے طویل مراثی لکھے ہیں، اور اسی مضمون کو ایک رباعی میں بخوبی سمو دیا ہے:

هر گهه که زشاخ سبز گُل ریخت حسنؑ
صد پاره جگر فتادش از راهِ دهن
پژمرده شگوفه گلشن زهراؑ را
گُل ریزدی ازبهاپرداخت چمن [2]

حضرت امام حسن علیہ السلام کے سلسلے میں یہ روایت موجود ہے کہ جب آپ کو زہر دغا دیا گیا تو آپ کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر قے کی صورت دہن سے باہر گر گئے تھے۔ اور اسی

ا۔ حدائق بخشش، ص ۳۴۷ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۸

زہر کے باعث آپ کو حسن سبز قبا کہا جاتا ہے کیونکہ زہر کے اثر سے آپ کا پورا بدن ہرا ہو گیا تھا۔ مرزا دبیرؔ نے اسی روایت کو نظم کیا ہے کہ جب امام حسنؑ کو زہر دیا گیا تو آپ کے جگر کے سینکڑوں ٹکڑے کٹ کر منہ کی راہ گرنے لگے۔ جس کی بنا پر گلشن زہرا مرجھا گیا گلستان بتولؑ پر خزاں آ گئی اور ہر طرف اداسی چھا گئی۔

هر صفحهٔ تن به سطرِ زخم شمشیر
از خندهٔ گل قضا کند بس تحریر
هیهات که برتن چو گلی برگ نهاد
هر خار کند تبسّم غنچه به تیرا[1]

مذکورہ بالا رباعی میں مرزا دبیرؔ نے تشبیہات کا خوبصورت امتزاج پیش کیا ہے اور ان تشبہات سے کلام میں خوبصورتی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلا بدن کے اعضاء کو صفحات سے اور شمشیر کے زخموں کو سطر سے تعبیر کیا ہے۔ امام حسینؑ کے بدن پر اس طرح زخم ہیں جیسے کسی نے پھول کی پتیاں جگہ جگہ بکھیر دی ہوں۔

خداوند کریم نے اپنی محبت و کرم کا ادنی نمونہ 'ماں' کو قرار دیا ہے ماں وہ ذات ہے جسے خود سے زیادہ اپنی اولاد کی فکر رہتی ہے۔ ماں وہ ذات ہے جو سردیوں کی سرد رات میں اپنے بچے کو سوکھے میں سلاتی ہے اور اس کے گیلے کیے ہوئے بستر پر خود لیٹ جاتی ہے کہ کہیں میرے لعل کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ ماں اولاد کے آگے ہر سکھ دکھ بھول جاتی ہے۔ اولاد کی خوشی میں خوش رہتی ہے اس کے غم میں اس سے زیادہ غمگین ہوتی ہے اگر کبھی گھر میں فاقہ ہو جائے تو اپنے حصے کی روٹیاں بھی اولاد کو دے دیتی ہے کیونکہ خود کے کھانے سے ماں کا پیٹ نہیں بھرتا بلکہ اولاد کے کھانے سے بھرتا ہے۔ ماں اپنے حصے کا کھانا بھی اولاد کو کھلا کر خوش ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی میں تو ماں ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ اس کا بچہ کامیاب ہو۔ خوش و خرم رہے اسے کوئی غم نہ ہو۔ ماں کی کوشش ہوتی ہے کہ اولاد کے بدلے کا غم اس کا نصیب ہو جائے لیکن اولاد کو کوئی غم والم نہ پہنچے۔

ا۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۴

کائنات کی تمام عورتوں کی سردار شہزادی کونین بنت رسول الثقلین ہیں۔ عورت کے تین کردار ہیں جس میں ایک عورت کی زندگی تقسیم ہوتی ہے باپ کے گھر میں بیٹی، شادی کے بعد بیوی اور گود آباد ہونے کے بعد ماں۔ ایک عورت کی خوبی و خامی انہیں کرداروں سے جانچی پرکھی جاتی ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی ناانصافی اس کے کردار کو مجروح کر دیتی ہے۔ حضور اکرم کی بیٹی کیوں کہ تمام عورتوں کی سردار ہیں نساء عالمین کے لیے نمونہ عمل ہیں لہذا ان تینوں کرداروں میں آپ کی کوئی نظیر نہیں۔ ایک عورت کا فریضہ دختری و فریضہ زوجیت میں فریضہ مادری کی وجہ سے کوتاہی کر سکتی ہے اولاد کے آگے وہ اپنے باپ اور شوہر کو بھی بھول سکتی ہے اور وہ ماں اگر شہزادی کونین ہوں تو وہ اپنے حسین پر ستم ہوتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتی ہیں۔ جو بچپنے میں حسین کے ذرا رونے پر گھبرا جاتی تھیں تو حسینؑ کی اتنی بڑی پریشانی میں کیسے ساتھ نہ ہوتیں۔

لب تشنہ شۂِ تشنہ دھن را کشتند
گویا یک بار پنجتنؑ را کشتند
زھراؑ ز لحد دست بر آورد و بگفت
فریاد غریب و بی وطن را کشتند[1]

پنجتن پاک میں پانچواں تن امام حسینؑ کی ذات پاک ہے اور اپنے والدین اپنے نانا اور برادر حسن کے لاڈلے ہیں۔ اسی مفہوم کو مرزا دبیر نے منظور نظر رکھا ہے۔ دبیر کہتے ہیں ہائے افسوس دشمنوں نے شہ تشنہ لبان کو پیاسا شہید کیا۔ شہ تشنہ لبان سے مراد مرزا دبیر کی یہ ہے کہ کربلا میں سب سے زیادہ پیاسے امام حسینؑ تھے کیونکہ جو ذمہ دار ہوتا ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے چھوٹے اس کے ماتحت سب سکون سے رہیں۔ اگر پریشانی آتی ہے تو سب سے پہلے سینہ سپر گھر کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ کربلا میں خیامِ حسینی کا امام حسینؑ کی موجودگی میں کوئی اور ذمہ دار نہیں ہے اب اگر حر جیسا کوئی مہمان پیاسا آئیگا تو اس کی ضیافت کے لئے پانی پیش کیا جائیگا چاہے خود میزبان پیاسا رہ جائے لیکن مہمان کو احساس تشنگی نہ ہونے پائے۔ نواسہ رسول حسینؑ کو شہید کرنا یعنی پنجتن کو شہید کرنا ہے کیونکہ پنجتن میں سے صرف امام حسینؑ

۱۔ رباعیات دبیر، ص۵۹۹

ہی باقی ہیں۔ ماں کا دل ہمیشہ اپنی اولاد کے لیے بے چین رہتا ہے اسی تڑپ کو مرزا دبیر نے موزوں کیا ہے کہ بے ساختہ مادرِ حسینؑ بنت رسول الثقلینؐ نے اپنے مرقد سے ہاتھ باہر نکالے اور فریاد کی۔ ہائے افسوس ایک غریب الوطن کو شہید کر ڈالا۔

آن مهد که جبرئیلؑ می جنبانید
آن مهد حسینؑ بود یا عرش مجید
آن صاحب مهد عرش وانگاه سرش
بنهاد بزیر تخت بد بخت یزید[1]

مذکورہ بالا رباعی میں صنعت تزلزل یا متزلزل موجود ہے۔ مرزا دبیر نے صنعتوں کا اس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ عمداً نہ کہی ہو آمد اور آورد کا امتیاز ہی مٹ گیا ہے۔ آمد ہی آمد نظر آتی ہے اور یہ صنعتیں خود بخود موزوں ہو گئی ہیں۔

صاحب ''بحر الفصاحت'' نے صنعت تزلزل کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''صنعت تزلزل یا متزلزل اس طرح ہے کہ حروف کی حرکت کے تغیر سے مدح یا مذمت ہو جائے''۔[2]

مذکورہ بالا رباعی کے مصرع ثانی میں 'آن مهد حسینؑ بود یا عرش مجید' میں اگر مہد کو مضاف اور حسینؑ کو مضاف الیہ پڑھیں تو مدح ہے اور اگر اس کے برعکس مہد کو مبتدا اور حسینؑ کو خبر پڑھیں تو معنی تبدیل ہو جائیں گے۔

مصرع چہارم میں صنعت تصحیف بھی پائی جاتی ہے۔ صاحب بحر الفصاحت نے تصحیف کی تعریف اس طرح بیان کی ہے۔

''شاعر ایسے الفاظ استعمال کرے کہ تغیر نقاط سے دوسرے لفظ بن جائیں اور اگر مدح ہو تو ہجو ہو جائے''[3]

'تخت' اور 'بخت' میں صنعت تصحیف پائی جاتی ہے۔ مرزا دبیر نے شعری فنکاری کے ساتھ ساتھ بہترین مضمون موزوں کیا ہے۔ مصرع اولی اور ثانی میں امام حسینؑ کے جھولے اور جھولا

۱۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۰ ۔ ۲۔ بحر الفصاحت نے صفحہ ۱۲۴۴ ۔ ۳۔ بحر الفصاحت نے صفحہ ۱۲۳۹

جھلانے والے جبرئیل کا تذکرہ کر کے یزید کی شدید مذمت کی ہے۔ یعنی جس کو جھولا جھلانے کے لئے جبریل اور ملائکہ آتے تھے جس کا مقام عرش اعلی سے بڑھ کر اسی کے سر کو بد بخت یزید نے اپنے تخت کے نیچے طشت میں رکھا۔

کتاب بحور الغمہ میں یہ روایت نقل ہے:

''ایک روز جبرئیل زمین پر نازل ہوئے اور دولت سرائے جناب فاطمہ زہراؑ کی طرف سے گزرے۔ دیکھا کہ جناب سیدہ آرام میں ہیں اور ان کا فرزند گہوارے میں رو رہا ہے۔ جبرئیل امام حسینؑ کو روتا دیکھ کر بیٹھ گئے اور جھولا جھلانے لگے اور لوریاں دینے لگے۔ جبرئیل امین گہوارہ ہلانے میں مشغول تھے کہ جناب فاطمہ زہراؑ خواب سے بیدار ہوگئیں۔ اپنے فرزند کا گہوارہ ہلتے دیکھا اور آواز سنی کہ کوئی شخص حسینؑ کو لوری دے رہا ہے مگر وہ شخص نظر نہیں آرہا۔ یہ دیکھ کر آپ متعجب ہوئیں جناب سیدہؑ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور تمام ماجرا عرض کیا۔ جناب رسالت مآب نے فرمایا اے پارہ جگر اللہ تعالی نے بہت سے ملائکہ محمد و آل محمد کی خدمت کے واسطے مقرر فرمائے ہیں۔ اس وقت جو فرشتہ میرے حسینؑ کا جھولا جھلا رہا ہے وہ جبرئیل ہے''۔[1]

بانوؑ در دشت نعشِ اکبرؑ میدید
کبری در روی مُردہ شوہر میدید
هم دخترِ شہؑ سکینہ دیدش دشتہ
هم خواهرِ شاهؑ و نیز مادر میدید[2]

کربلائے معلی میں عصر عاشور کے بعد کا منظر مرزا دبیر نے نظم کیا ہے۔ اہل حرم کی بے چینی و بے تابی کو اس رباعی سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک ماں ہے جو اپنے جوان لعل

ا۔ بحور الغمہ ص ۲۱۲ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۰

علی اکبر کو تلاش کر رہی ہے اور جوان بیٹے کی لاش دیکھنا ایک ماں کے لئے سخت مرحلہ ہے۔ سید الشہداء کی لاڈلی بیٹی سکینہ دشت میں پہنچ کر کبھی بابا کو ڈھونڈتی ہے اور کبھی پھوپی کو آواز دیتی ہے۔ ایک چار سالہ بچی کے لئے کس قدر سخت مرحلہ ہے کہ وہ لاشوں سے بھرے میدان میں جا کر لاشوں کے درمیان اپنے بابا کو تلاش کرے۔ بحور الغمہ میں یہ روایت نقل ہے:

> ''شام غریباں میں اہلبیت شہدا کے مقتل میں روتے تھے اور سر پیٹتے تھے۔ جناب سکینہ اپنے پدر بزرگوار کی لاش پر بیٹھ کر حضرت کے شانے کو تھامے ہوئے اپنے بابا کا ہاتھ زیر بغل لئے ہوئے روتی تھیں۔ پس وہ صاحبزادی کبھی تو اپنے پدر بزرگوار کے شانوں کو سونگھتی اور کبھی حضرت کی انگلیوں کو اپنے چہرے پر لگاتی اور کبھی آنکھوں سے لگاتی تھی۔ [۱]

مصرع چہارم میں ''خواہر'' اور ''مادر'' میں 'صنعت تضمن المز دوج' موجود ہے۔ بحر الفصاحت میں صنعت تضمن المز دوج کی تعریف اس طرح تحریر ہے۔

> ''رعایت قوانی کے بعد اثنائے کلام میں ایسے دو لفظ جمع کیے جائیں جو وزن اور روی میں موافق ہوں''۔ [۲]

هر گهه حسینؑ ز اقربا تنها ماند
با جسم هزار زخم خون بالاماند
خوناب گریست چشم هر زخم بر او
محروم زیک قطره چو از دریا ماند [۳]

امام حسینؑ کے اصحاب کی وفاداری بےنظیر ہے کیونکہ کربلا میں امام کے ساتھ آنے والے تمام صحابہ کو معلوم تھا کہ انہیں موت سے ہم آغوش ہونا ہے ہر حال میں موت ان کا مقدر ہے وہ کربلا میں کسی لالچ، کسی مال غنیمت کی طمع میں نہیں آئے تھے بلکہ وہ فریضہ دینی سمجھ کر آئے تھے۔ کوئی اپنے بچپن کی دوستی نبھانے آیا تھا تو کوئی اپنی محبت۔ کوئی اپنا دیرینہ عقیدہ چھوڑ کر آیا

۱۔ بحور الغمہ، ص ۴۳۸ ۲۔ بحر الفصاحت صفحہ ۱۲۶۵ ۳۔ رباعیات دبیر، ص ۱۰۱

تھا تو کوئی اپنا مذہب۔ ان اصحاب میں وہبِ کلبی جیسا ایک دن کا دولہا بھی ہے اور جون حبشی جیسا غلام بھی۔ انہیں حسینؑ سے اس قدر پیار ہے کہ موت سے بھی ٹکرانے کو تیار ہیں۔ اور یہ مودت بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ دین خدا کو بچانے اور محبت خدا کی بنا پر ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی کو امام حسین نے مجبور نہیں کیا کسی کو قسم دے کر اپنے ساتھ نہیں روکا، بلکہ شب عاشور شہ دین نے شمع گل کر کے سب جاں نثاروں سے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی جانا چاہتا ہے تو بے شک چلا جائے میں نے اپنی بیعت اٹھالی ہے۔ میں نے شمع اسی لئے گل کی ہے کہ جانے والے کو شرمندگی کا احساس نہ ہو۔ لیکن جونہی شمع روشن کی گئی دیکھا سب نے اپنی تلواریں اپنی گردنوں پہ رکھی ہوئی ہیں اور فریاد کناں ہیں مولا ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ اردو شعراء نے بھی اس واقعہ کو اپنے کلام میں بطور استعارہ نظم کیا ہے مثلاً آدمی سیتھلی یہ شعر اس واقعہ کا غماز ہے۔

شمع گل کرکے آزماتے ہیں
دوستی کربلا کے سائے میں[۱]

جب تک ایک بھی صحابی زندہ رہا حسینؑ میدان کارزار میں جنگ کے لئے نہیں آئے سارے صحابہ ایک ایک کر کے اجازت لے کر جنگ کے لئے جاتے رہے۔ امام حسینؑ نے کربلا میں سب سے پہلے اصحاب کو جنگ کے لئے بھیجا پھر رشتہ داروں کو پھر اپنے بھائیوں کو اپنے بیٹوں کو اور جب کوئی نہ رہا تو سب سے آخر میں خود گئے۔ وہ اس لئے کہ کربلا میں زندگی بہت مشکل تھی تین دن کی بھوک پیاس میں جنگ کرنا بہت مشکل تھا زندہ رہنا سانس لینا بہت مشکل تھا اس لئے جو جتنا قریب تھا اس کا امتحان اتنا ہی زیادہ سخت۔ جناب علی اکبر سب سے آخر میں گئے چونکہ امام کو اپنے اس بیٹے سے بہت محبت تھی۔ کربلا میں موت پر زندگی بھاری تھی۔ سب سے آخر میں خود جنگ کے لئے گئے۔ اس مفہوم کو مرزا دبیر نے اس طرح ادا کیا ہے کہ قاری پڑھ کر تڑپ اٹھے۔ بیکسی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ حسینؑ کی تنہائی کے مونس و ہمدم ان کے اپنے زخم ہیں زخموں کے علاوہ کوئی پاس نہیں۔ اور زخم صرف ہمدم و ساتھی ہی نہیں ہے بلکہ حسینؑ غریب کی

۱۔ مخطوطہ آدمی سیتھلی نمبر ۱۲، ص ۵

پیاس پر آنسو برسا رہے ہیں۔ مرزا دبیر کی یہ مہارت ہے کہ زخموں کو اور ان سے بہنے والے خون کو بھی ایک خوبصورت وجہ دے دی۔ زخم درد و مصیبت کے موجب ہوتے ہیں کبھی کبھی تو ہلاکت کے باعث بھی بن جاتے ہیں زخموں کی ہی بگڑی ہوئی صورت ناسور کہلاتی ہے جو نہایت مہلک و موذی مرض ہے زخم جینا مشکل کر دیتا ہے لیکن یہاں مرزا دبیر نے اتنا خوبصورت مضمون باندھا ہے کہ زخم کو ہی ساتھی بنا دیا اور ان زخموں سے بہنے والے خون کو بھی ایک حسین شکل دے دی۔

شه برلب جوی چشم وا عمر حباب
در جام تهی هوای یک قطرۀ آب
هر چشم چو چشمه خشک لب چون ساحل
هر چشمۀ چشم آه گریان چو سحاب[1]

کربلا کے میدان میں بظاہر امام حسینؑ دنیا سے کوچ کر گئے اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ لیکن حقیقتاً حسین شہید ہو کر زندگی جاودانی پا گئے اور چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ امام حسینؑ کے غم میں یہ تاثیر ہے کہ ہر صاحب دل غم حسین میں اشک بہائے بنا نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اس درجہ تاثیر دیکھی گئی ہے کہ زبان پر نام حسینؑ آتے ہی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ غم حسین میں آنسوؤں کے لئے آنکھیں جھرنا بن جاتی ہیں اور سوکھے ہوئے لب ساحل بن جاتے ہیں۔ اور آنکھ بادل کی مانند برستی چلی جاتی ہے۔

اکبرؑ چون به خونِ خویش در جنگ به خفت
وز چشم پدر نیّر اکبر به نهفت
آمادۀ مرگ شد حسینؑ ابنِ علیؑ
زد نالۀ والصفا علی الدنیا گفت[2]

یہ بات مشہور ہے اور تمام علماء، حکماء، محققین اور عوام الناس نے اسے تسلیم کیا ہے کہ جوان بیٹا باپ کا سہارا ہوتا ہے قوت بازو ہوتا ہے آنکھوں کا نور ہوتا ہے دل کا سرور ہوتا ہے لیکن جب وہ آنکھوں سے دور ہوتا ہے تو باپ کیلئے سب کچھ بے نور ہو جاتا ہے نہ وہ کیف رہتا ہے نہ سرور۔

۱۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۱ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۳

امام حسینؑ کو اپنے جوان بیٹے علی اکبر سے اس لئے بھی خاص انسیت و والہانہ محبت تھی کیوں کہ اکبر ہو بہو نانا کی تصویر تھے یعنی شبیہ رسول تھے۔ کتاب مثیر الاحزان میں روایت ہے جب علی اکبر جنگ کے لئے روانہ ہوئے تو امام حسین نے پکار کر کہا:

"**اللھم اشھد علی ھٰئولاء ، فقد برز الیھم اشبہ الناس برسولک محمد خَلقاً و خُلقاو منطقاً**۔ پروردگار گواہ رہنا اب میں نے اُسے ان کی طرف بھیجا ہے جو ہو بہو تیرے رسول کی شبیہ ہے صورت میں رفتار میں گفتار میں کردار میں۔ [۱]

آگے فرمایا: **کنااذا اشتقنا الی رویۃ نبیک نظرنا الیہ**۔ ہمیں جب بھی تیرے نبی کی زیارت کا اشتیاق ہوتا تھا تو اس کے چہرے کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ [۲]

اس لئے مرزا دبیر نے یہ مضمون موزوں کیا ہے کہ جب ہم شکل محمد مصطفیٰ اپنے خون میں نہا کر، سینہ میں برچھی کی انی کھا کر جام شہادت نوش کر کے موت سے ہم آغوش ہو گئے تو باپ کی آنکھوں کی تابانی، چمک، روشنی سب ختم ہوگئی۔ اور آپ نے گریہ و زاری کرتے ہوئے کہا اے بیٹا تیرے بعد یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں۔

بکشادہ درِ حسینؑ بر روی دعاست
ھر ذرّۂ خاکِ تربتش خاک شفاست
سپرد بہ قضا بدستِ او کلکِ قدر
مختار بہ کار خانۂ خاصِ خداست [۳]

خاک کربلا کو یہ خاص فضیلت حاصل ہے کہ اس میں شفا ہے یعنی خاک کربلا خاک شفا کے نام سے مشہور ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اس میں معصومؑ کا خون مخلوط ہے۔ اس لئے کہ تاریخ اسلام شاہد ہے اس سرزمین پر جس نبیؑ یا رسولؑ کا بھی گزر ہوا اسے کچھ نہ کچھ پریشانی ضرور لاحق ہوئی ان کے خون کے قطرے ضرور اس سرزمین میں گرے شاید اسی لئے اس

۱۔ مثیر الاحزان، ص ۶۸ ۲۔ اللہوف، سید ابن طاؤس، ص ۱۳۹ ۳۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۲

سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے۔ دوسرے مصرعے میں مرزا دبیر نے اسی بات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ مرزا دبیر کہتے ہیں کہ باب استجابت امام حسینؑ کے لئے کھلا ہوا ہے انہیں کی ذات کے توسل سے خدا سے دعا کرو۔ ان کی تربت کی خاک کا ہر ذرہ شفا ہے۔ کاتب تقدیر نے اپنا قضا وقدر کا قلم انہیں کو سپرد کر دیا ہے۔ انہیں کارخانہ قدرت میں خصوصی اختیار حاصل ہے۔

برخاک ز آیت وحدیث ست سجود
هر مرسلؑ وهر نبیؐ بریں ساجد بود
منکر که به شیعه داد الزام عبث
حقّا به خدا و انبیاؑ طعن نمود [1]

مرزا دبیر کی اس رباعی کا موضوع نہ منقبتی ہے نہ نعتیہ، نہ مدحیہ ہے، نہ رثائی بلکہ اس رباعی کو اگر فقہی یا فطری کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ مرزا دبیر نے اس رباعی میں اس مسئلہ شرعی ''سجدہ بر خاک'' کو موضوع بنایا ہے جس پر کچھ اعتراضات وارد ہوتے رہے ہیں حالانکہ قرآن واحادیث و تاریخ پر نظر رکھنے والے افراد ان اعتراضات پر اعتنا نہیں کرتے۔ قرآن و احادیث سے کچھ حوالے پیش ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ مرزا دبیر اپنے دعوے میں کس حد تک درست ہیں۔ قرآن مجید کے سورۂ فتح میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

"مُحَمَّد رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُم رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضوَانًا سِيمَاهُم فِي وُجُوهِهِم مِّنْ اَثَرِ السُّجُودِ .

ترجمہ: محمد خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں تو ان کو دیکھے گا خدا کے سامنے جھکے ہوئے اور سربسجود ہیں خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں میں گٹے پڑے ہوئے ہیں۔[2]

ا۔ رباعیات دبیر، ص۲۰۲ ۲۔ سورہ فتح، پ ۲۶، آیہ ۲۹

حضرت رسول کریمؐ کی حدیث مبارک ہے:

قال رسول اللهؐ: "جُعِلَتْ لِیَ الْارْضَ مَسْجِداً وَّ طُهُوْراً"

ترجمہ: رسول اکرم نے فرمایا: میرے لئے زمین کو سجدہ گاہ اور پاک و پاکیزہ قرار دیا گیا۔[1]

سنن ابن داؤد میں جابر ابن عبداللہ انصاری سے روایت موجود ہے:

"**روی جابر بن عبدالله :کنت اصلی الظهر مع رسول الله (ص) فآخذ قبضة من الحصی لتبرد فی کفی اضعها لجبهتی اسجد علیها لشدة الحر.**" ترجمہ: جابر ابن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ ہم رسول کریمؐ کے ہمراہ نماز ظہر ادا کر رہے تھے میں نے سنگریزے کو گرمی کی وجہ سے اپنی مٹھی میں پکڑا ہوا تھا تا کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے اور اس پر سجدہ کر سکیں۔[2]

مندرجہ بالا اقوال کی روشنی میں مرزا دبیرؔ کی اس رباعی کا لطف دوبالا جاتا ہے۔ پہلے ہی مصرع میں خاک پر سجدے کرنے کی درستگی کے لئے آیت و احادیث کا ذکر کر رہے ہیں ہر نبی، ہر رسول نے اس پر سجدہ کیا۔ اب جو بھی اس خاک پر سجدہ کرنے پر اعتراض کرتے ہیں طعنہ دیتے ہیں ان کا یہ فعل عبث ہے اس لئے کہ خاک پر سجدہ کرنا تو سنت رسولؐ ہے لہٰذا یہ اعتراض درحقیقت انبیاء و رسل تک پہنچتا ہے۔

عابدؑ بیمار وپای او در زنجیر
اصغرؑ بلب تشنه و در حلقش تیر
خورد اکبرؑ نوجوان به سینه نیزه
سیراب به آبِ تیغ حلق شبیر[3]

ا۔ صحیح بخاری، ج۱، ص ۲۰۶؛ صحیح مسلم، ج۲، ص۶۴ بحارالانوار، ج۸۰، ص ۲۷۸؛ آثار الصادقین، ج۱۱، ص ۱۵۵۔

۲۔ سنن ابن داؤد، ج۱، ص۱۱۰ ۳۔ رباعیات دبیر، ص۲۰۳

مذکورہ رباعی میں مرزا دبیر نے بعد عصر عاشورہ مقتل کا عجیب منظر بیان کیا ہے۔ جہاں ہر سو لاچاری، اضطراب، افراتفری، حبس و گھٹن ہے۔ لیکن مرزا دبیر نے اس ہولناک منظر کو نہایت شگفتہ اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ سید سجاد بیمار ہیں اور وہ زنجیروں میں گرفتار ہیں۔ اصغر بے شیر کے لبوں پر پیاس سے پپڑی جمی ہوئی تھی جسے تیر سہ شعبہ نے بجھایا۔ اکبر سا نوجوان جو شبیہ رسولؐ ہے وہ اپنے سینے پر نیزے کی انی کھا کر سو رہا۔ امام حسینؑ جو تین روز سے زیادہ کے پیاسے ہیں ان کو خنجر و تلوار کے پانی نے سیراب کر دیا۔ مذکورہ رباعی میں مرزا دبیر نے صنعت توسیم کا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ صنعت توسیم کی تعریف "**المعجم فی معاییر اشعار العجم**" میں الفاظ میں مندرج ہے:

> **"توسیم آنست که بنای قافیت بر حرفی نهد کی نام ممدوح یا آنچه مقصود شاعر ست در آن تنسیق گردد".** ۱؎

نجم الغنی رامپوی تعریف توسیم کے لئے لکھتے ہیں:

> "صنعت توسیم یعنی شاعر بنیاد قافیے کی ایسے حروف پر رکھے کہ ممدوح کا نام اس میں آ جائے"۔ ۲؎

اس رباعی کے پہلے مصرع میں "زنجیر" دوسرے میں "تیر" استعمال کر کے چوتھے مصرع میں اپنے ممدوح کا نام "شبیر" استعمال کیا ہے۔

از فرطِ عطش جگر کباب است حسینؑ
محتاج بینم قطرهٔ آب است حسینؑ
افتادگیش چو خاک لب خشک بدشت
زان روست که ابنِ بو ترابؑ است حسینؑ ۳؎

مرزا دبیر نے مذکورہ رثائی رباعی میں بھی فضائل کا گوشہ نکالا ہے۔ پیاس کی وجہ سے امام حسینؑ کا جگر کباب ہو گیا ہے یعنی نواسہ رسولؐ پانی کے ایک ایک قطرے کے لئے محتاج ہیں۔

۱۔ المعجم، ص ۳۷۳ ۔۔۔ ۲۔ بحر الفصاحت، صفحہ ۱۲۴۰ ۔۔۔ ۳۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۴

حسینؑ جب گھوڑے سے گرے تو اس طرح منہ کے بل گرے کہ آپ کے سوکھے لب خاک آلود ہو گئے۔ دیکھنے پہ لگتا ہے کہ ابوتراب کے بیٹے کو تراب نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

صبری به مشیت خدا داشت حسینؑ
از هرچه رود برو روا داشت حسینؑ
می کرد بهرِ جفاکش آمد صبری
چون ورثه ز مرتضیٰؑ داشت حسینؑ[۱]

امام حسینؑ کو خدا نے خاص صبر کا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ اسی وجہ سے امام حسینؑ پر جو گزری اس پر آپ شاکر رہے۔ امام حسینؑ مصائب و آلام پر شکر کناں ہونے کی ایک وجہ مولاے کائنات سے ورثے میں صبر پانا بھی ہے۔

دایم ببر بتوّل جا داشت حسینؑ
در فرش خود از نبیؐ ردا داشت حسینؑ
زان روی سرش ز تن نمودند جدا
کان فضل وشرف جدا جدا داشت حسینؑ[۲]

امام حسینؑ سے شہزادی کونینؑ کو خاص محبت تھی جو امام حسینؑ کے لئے خاص شرف ہے۔ اسی طرح فرش کی جگہ نانا نبیؐ کی ردا ہے۔ آپ کے سر کو جسم سے اس طرح جدا کیا گیا ہے کہ جیسے فضل اور شرف الگ الگ کر دئے گئے ہوں۔ اس رباعی کے چوتھے مصرع کے حشو ''جدا جدا'' میں صنعت تکرار مطلق موجود ہے۔ آغا محمد کاظم شیرازی نے تجنیس مکرر کی تعریف یوں بیان کی ہے:

صنعت تکرار کی تعریف صاحب ''بحر الفصاحت'' کی نظر میں۔

> ''دو لفظوں کو جو ایک ہی معنی رکھتے ہوں مصرعوں یا شعر میں برابر جمع کرنا۔ اس کی سات قسمیں گنوائی ہیں۔ تکریر مطلق یہ اس طرح ہے کہ ایک شعر میں لفظ مکرر آویں خواہ دونوں مصرعوں کے اول میں، یا صرف مصرع اول کے شروع میں، یا صرف مصرع ثانی کے اول میں، یا مصرعہ اول کے حشو میں، یا دوسرے مصرع کے حشو میں''۔[۳]

۱۔ رباعیات دبیر، ص۶۰۵ ۲۔ ایضا، ص۶۰۵ ۳۔ بحر الفصاحت صفحہ ۱۲۳۵

بی جرُم حسینؑ را چو یا رب کشتند
آن قوم بفتوی چه مذهب کشتند
کردند چها قساوت آن سنگ دلان
کشتندش و پیش چشمِ زینبؑ کشتند[1]

کربلا وہ سانحہ پر ملال ہے جس میں ظالم ستمگروں نے سبھی ظلم روا رکھے جو زیادہ سے زیادہ کیے جا سکتے تھے۔ اب اس میں جواں بیٹے کے سینے پر برچھی کی انی توڑنا ہو یا شیرخوار ششماہے کے گلوے نازنین پر تیر سہ شعبہ سے حملہ کرنا ہو۔ قوت بازو یعنی بھائی کے دونوں بازو قلم کرنا ہوں یا نوجوان بھتیجے کی زندگی میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس کے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ بیمار کے نیچے سے بستر کھینچنا ہو یا یتیم بچی کے کانوں سے گوشوارے کھینچنا۔ کربلا میں ظلم و ستم کی انتہا ہوگئی۔ لیکن کسی نے بڑھ کر یہ نہیں پوچھا کہ حسینؑ غریب کو کس جرم کی پاداش میں شہید کیا۔ اس قوم نے کس مذہب کے فتوے کی رو سے یہ فعل بدانجام دیا۔ ان ظالموں نے کس قدر ظلم و ستم کیا کہ ایک بھائی کو بہن کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا۔ کسی بھی بہن کے لئے یہ منظر نہایت دردناک ہے کہ اس کے بھائی کے گلے پر اس کی آنکھوں کے سامنے خنجر چلایا جائے اس کی آنکھوں کے سامنے بھائی کا سر جسم سے جدا کیا جائے اور بہن اتنی مجبور ہو کہ کچھ نہ کر سکے۔

ای چرخ چه بد گرفته آه نهاد
از جور و ستم نهادهٔ بد بنیاد
لب تشنه شهؑ و ندادیش قطرهٔ آب
فریاد ز بی داد تو ظالم فریاد[2]

پیاس کی تکلیف اس وقت زیادہ شدید ہو جاتی ہے جب سامنے پانی موجود ہو اور وہ کسی سبب اس سے سیرابی نہ کر سکے اور اگر اس کے ساتھ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی پیاس سے جاں بلب ہوں تو یہ پیاس برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ دنیا میں ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ

۱۔ رباعیات دبیر، ص ۵۹۷ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۵۹۷

کسی کو پانی کے لئے ترسایا جائے بلکہ پیاسے کو پانی دے کر اس کے سامنے زمین پر بہا دیا جائے۔ کم سے کم یہ امر خلاف انسانیت ہے۔ انسانیت کے ناطے کسی پیاسے کو پانی پلانا ثواب ہی ثواب ہے اور اگر وہ نواسہ رسولؐ ہو تو اس ثواب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن وہ کیسے کمبخت و بدنصیب تھے جنہوں نے دنیاوی جاہ وحشم کی خاطر اپنے رسولؐ اکرم کو غم میں گرفتار کیا انہیں رونے پر مجبور کر دیا۔ مرزا دبیر مذکورہ رباعی میں زمانے سے شکوہ کناں ہیں۔ اے چرخ (کائنات) یہ تو نے کیسا وقت دکھایا کہ اس قدر ظلم وستم ڈھائے گئے کہ ظلم بھی تھک گیا۔ حسینؑ مظلوم کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور ایک قطرہ آب تک نہ دیا۔ اے ظالم تیرے ظلم وستم خود فریادی ہیں۔

مارا به اضافه بر سرِ جمع نهاد
دردا که جماعة رعایه برباد
مشغول بکار گشت وکشت او را
خود غافل و در رسید هنگام حصاد[۱]

کسی ملک وملت کی یہ تہذیب نہیں ہے کہ پہلے مہمان بلایا جائے اور پھر اس کو تہہ تیغ کر دیا جائے بلکہ مہمان کو تو ہر مذہب وملت میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ہر خواہش پورا کرنے کوشش کی جاتی ہے۔ میزبان کی حتی الامکان سعی رہتی ہے کہ اس کا مہمان کسی طرح بھی اس سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ دین اسلام دنیا کا سب سے بہترین مذہب ہے۔ جس کے معنی ہی سلامتی کے ہیں یعنی اسلام راحت وسکون کا مذہب ہے۔ لہذا اس کے ماننے والے اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کی بھی یہ شان ہونی چاہیے کہ ان کے دست و پا سے ان کے زبان و بیان، ان کے فکر وخیال سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

اسلام میں مہمان نوازی کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ میدان کربلا میں حسینی لشکر بھی اسلام کا حامی و پیروکار تھا اور لشکر یزیدی مسلمان ہونے کا دعوی کرتا تھا۔ لشکر حسینی میں تو سبھی حفاظ قرآن تھے اور کچھ لشکر یزید میں بھی تھے۔ حر کا لشکر جب حسین کے پاس بھوکا پیاسا پہنچا تو امام حسینؑ نے حر اور اس کے لشکر کو سیراب کیا۔ لیکن لشکر یزید نے حسین پر پانی بند کر دیا بلکہ جب امام حسینؑ

۱۔ رباعیات دبیر، ص۵۹۹

نے شیرخوار کے لئے سوال آب کیا تو اس شیرخوار کی پیاس تیر سہ شعبہ سے بجھائی گئی۔ مرزا دبیر نے مذکورہ رباعی میں انہیں مفاہیم کو موزوں کیا ہے۔

ای چرخ حرون زدست جورت فریاد
کم بود هر آنچه رفت بر شه بی داد
کشتیش گرسنه تشنه پس اشتربان
در دست بریدنش ز شر دست کشاد[1]

نواسہ رسول الثقلینؐ حضرت امام حسینؑ نے اپنے نانا محمد مصطفیؐ سے طفلی میں جو وعدہ کیا تھا اس کو میدان کربلا میں وفا کیا۔ اس وعدے کو وفا کرنے کے لئے امام نے سب عزیز و اقارب کی قربانی راہ خدا میں پیش فرما دی۔ قوت بازو بھائی عباس، آنکھوں کا نور علی اکبر، بھائی کی نشانی قاسم، بچپن کا دوست حبیب سبھی کو راہ خدا میں قربان کر دیا۔ یہ مصائب تو امام کی زندگی میں ہی تھے لیکن اس کے بعد کے مصائب جو اہل حرم پر پڑے یعنی بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کرایا گیا ہاتھ پس گردن باندھے گئے جس کی وجہ سے مائیں اپنے بچوں کو سنبھال نہیں پا رہی تھیں جو بچہ پشت شتر سے گر گیا وہ دوبارہ اپنی ماں سے نہیں ملا۔ کربلا کے مصائب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ مرزا دبیر نے مصرع ثانی میں سب کچھ کہہ دیا ''جو کچھ بھی حسین پر گزری وہ ستم تو کچھ بھی نہیں تھا'' اس میں ایک درد ہے ایک تڑپ ہے ایک صاحب دل ہی اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔

زهراً که حسینً بود دل پارهٔ او
روح القدس و زعرش غم خوارهِ او
گهوارهٔ او به عرش می ماند که بود
جبرئیل مقیم زیر گهوارهٔ او [2]

مرزا دبیر نے مذکورہ رباعی فضائل میں تحریر کی ہے۔ جس میں امام حسینؑ کی عظمت و اہمیت بیان کی ہے۔ امام حسینؑ یعنی جو بنت رسولؐ کا جگر گوشہ ہیں۔ روح الامین اور عرش عظیم ان

۱۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۰ ۲۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۷

کے غمخوار ہیں۔ان کا گہوارہ تو آسمان سے برتر ہے اس لئے کہ جبرئیل امین عرش پر قیام کرتے ہیں لیکن گہوارہ پر قیام نہیں کرتے بلکہ زیر سایہ گہوارہ قیام کرتے ہیں۔ایک طرح سے مرزا دبیر نے عرش اور گہوارہ حسینؑ میں موازنہ کیا ہے۔

صد چاک رسیده همچو گل برتنِ او
آغشته بخون چون غنچه پیرهن او
پیغام ده شهادتش فصلِ بهار
بشگفته ز زخم جا بجا گلشن او [۱]

مذکورہ رباعی میں مرزا دبیر نے تشبیہات کا بہترین استعمال کیا ہے اور درد وغم کو بھی الگ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے گویا مصائب سے فضائل کا گوشہ نکالا ہے۔امام حسینؑ کے جسم اطہر پر جو زخم تھے انہیں پھول کی پتیوں سے تشبیہ دی ہے اور بہتے ہوئے خون کو پھول کا رنگ قرار دیا ہے۔امام حسینؑ کی شہادت کو فصل بہار سے تعبیر کیا ہے کیونکہ بہار جہاں جہاں تک جاتی ہے پھول کھلاتی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح شہادت حسینی بھی دین اسلام کے لئے بہار ہے کہ جہاں تک بھی شہادت حسینیؑ کا پیغام پہنچا وہاں تک اسلام کو نئی زندگی ملتی چلی گئی۔وہ شام و کوفہ جسے یزید نے اپنی عیاشی کا اڈہ بنا رکھا تھا اس دربار میں بھی خطبہ سجاد کے بعد اذان کی آواز بلند ہوگئی۔

عباسؑ جگر بندِ شۂِ بدر و حنین
چون برلب نهر قتل شد بهر حسینؑ
آن وقتِ نماز را به رسالِ یدین
بر خواند نماز را به رسان یدین [۲]

مرزا صاحب نے یہ رباعی عباسؑ علمدار، قوت بازوے حسینؑ کے لئے تحریر کی ہے۔عباس فاتح بدر وحنین یعنی مولاے کائنات کے جگر گوشہ ہیں جو کہ امام حسین کی خاطر نہر کے کنارے شہید کر دئے گئے۔جس وقت عباس شہید ہوئے نماز کا وقت ہو گیا تھا تو عباس نے اپنے بازو کٹا کر نماز ادا کی۔

۱۔رباعیات دبیر،ص۶۰۷ ۲۔رباعیات دبیر،ص۶۰۸

چون طبع باستحاله دارد تاثیر
از بهر رضاع طفل خون گردد شیر
بر زعمِ طبیعت از برای اصغرؑ
خون کرد بدل ز شیر در حلقش تیر ۱؎

مرزا دبیرؔ نے مذکورہ رباعی میں جو مضمون نظم کیا ہے وہ انسانی فطرت سے متعلق ہے قدرت نے شیرخوار کے لئے ماں کے خون کو دودھ میں تبدیل کیا ہے اور فطرت کبھی بدلتی نہیں۔ عادت اور فطرت میں یہ اصل فرق ہے کہ عادت بدل جاتی ہے لیکن فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ مرزا دبیرؔ نے اسی فطری قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے فضیلت علی اصغر بیان کی ہے۔ آپ کہتے ہیں طبیعت استحالہ سے اثر لیتی ہے لہذا شیرخوار کی شکم سیری کے لئے خون دودھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن اصغر بے شیر کے لئے قانون فطرت بدل گیا کہ گلے کے تیر نے دودھ کو خون میں تبدیل کر دیا۔

این شهر بخاطر ملومان شادست
معموره خلق و حلم و عدل و دادست
هر فرد بشر دفتر خُلق است دبیرؔ
این شهر ز اخلاق عظیم آباد است ۲؎

مرزا دبیرؔ نے اپنی آخری عمر میں دوسرے شہروں کا سفر شروع کیا تھا جن میں عظیم آباد خاص ہے جہاں اکثر مجالس میں مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک مجلس کو خطاب کرنے سے پہلے یہ رباعی پیش کی۔ عظیم آباد کو جو خوبصورت وجہ تسمیہ یا اس نام کی جو توجیہ مرزا دبیرؔ نے پیش کی ہے شاید اس سے بہتر بیان کرنا مشکل ہے۔ اس تعریف کو سن کر ہر عظیم آبادی جھوم اٹھے گا۔ کہتے ہیں اس شہر کے لوگ با اخلاق، انصاف پرور، عادل اور حلیم ہیں۔ یہاں کا ہر فرد اخلاق کا دفتر ہے مجسمہ اخلاق ہے۔ یہ شہر اخلاق کی بنا پر عظیم آباد ہے۔ اس سلسلے میں ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

۱۔ رباعیات دبیر، ص ۶۰۸   ۲۔ مرزا سلامت علی دبیر، ص ۱۴۹

''عظیم آباد میں اکثر دہلی والوں کے خاندان آ کے آباد ہو گئے تھے۔ جو مرزا دبیر کی زبان کے قدر شناس تھے اور زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کو جوہر شاعری سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی اتنی خاطر مدارات کی کہ مرزا دبیر نے پھر کسی طرف کا رخ نہ کیا اور عظیم آباد کے لوگوں کے خلق کی ہمیشہ تعریف کی۔ وہاں مرزا دبیر کے قدر شناس رئیسوں میں میر محسن صاحب اور میر عباس صاحب تھے۔ ایسے قدر دانوں کے لئے مرزا دبیر نے یہ رباعی پیش کی''۔[1]

آخر میں مرزا دبیر کی وہ رباعی نقل کی جارہی ہے جو ان کی ذات سے متعلق ہے۔مرزا صاحب نے مذکورہ ذیل رباعی میں اپنے تاثرات، جذبات واحساسات کو لفظی جامہ پہنا کر نظم کی لڑی میں پرو دیا ہے۔مرزا دبیر کلکتہ اپنی آنکھیں بنوانے گئے تھے جس کی قطعہ تاریخ بھی موزوں کیا تھا جس پر تاریخ گوئی کے ذیل میں بحث ہوگی۔اس قطعہ تاریخ کے علاوہ یہ رباعی بھی اسی واقعہ کی یادگار ہے:

از چشم به رخ کشاده منظر دارم
زان درجه هوای خاک در سر دارم
از خاک چو چشم بر کشاید کورم
بینید که چشم خاک زان در دارم [2]

دوا دینا ڈاکٹر، طبیب وحکیم کا کام ہے لیکن شفا خدا کی جانب سے عطا ہوتی ہے وہ چاہے تو پل میں شفا مل جائے نہ چاہے تو طویل وقفہ کے بعد بھی مرض سے افاقہ نہ ہو۔اسی لئے لازم ہے کہ مرض سے شفایابی کے بعد اس ذات بابرکات کا شکر ادا کیا جائے۔مرزا دبیر کی یہ رباعی بھی دراصل خداوند عالم کا شکرانہ ہے جس میں خدا کی نعمتوں، کرم فرمائیوں کا ذکر موجود ہے۔مرزا دبیر کہتے ہیں میری نگاہوں میں اسی در کا فیض ہے اسی در سے وابستگی میری بصارت

۱۔حیات دبیر،ص۱۰۴،۱۰۵ ۲۔رباعیات دبیر،ص۶۰۴

کی موجب ہے۔ اسی لئے میرے ذہن و دل میں اسی در کا سودا ہمیشہ رہتا ہے۔ میری آنکھیں نا بینا تھیں لیکن جب بصارت پلٹی تو دیکھا اسی آستان کی مٹی میری آنکھوں کا سرمہ بنی ہے اسی سے مجھے یہ روشنی حاصل ہوئی اور میری یہ تاریک دنیا دوبارہ سے پرنور و تابناک ہوگئی۔

المختصر مرزا دبیر کی فارسی رباعیات کے مطالعہ سے ان کی فارسی زبان پر قدرت و مہارت اور علم عروض سے واقفیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

قطعات

فیروز اللغات فارسی حصہ دوم میں ''قطعہ'' کے لغوی معنی ہیں ٹکڑا، ہر چیز کا ٹکڑا، وہ نظم جو مطلع کے بغیر ہو اور دو شعروں سے کم نہ ہو زیادہ جس قدر بھی ہو۔ [۱]

اصطلاحی تعریف ''انواع شعر فارسی'' میں اس طرح مذکور ہے:

> **''قطعه بکسر اول،در لغت به معنی یک پاره از هر چیزی است، اما فارسی زبانان آن را به فتح اول تلفظ کرده و جمع آن را به جای (قطع) قطعات گفته اند. در اصطلاح ، قطعه نوعی از شعر است که دارای ابیات متحد الوزن و متحد القافیه باشد بدون آنکه مطلع آن مصرّع باشد''.** [۲]

امداد امام اثر ''کاشف الحقائق'' میں رقمطراز ہیں:

> ''قطعہ: عروضی ترکیب اس صنف شاعری کی وہی ہے جو قصیدہ کی ہے۔ الا یہ کہ اس صنف شاعری میں ہمیشہ مطلع ندارد ہوتا ہے اور اشعار کے عدد چار سے کم نہیں ہوتے۔ مضامین کے اعتبار سے یہ صنف شاعری ایک اعلا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے مضامین کو مسائل اخلاق وحکمت پر مشتمل ہونا چاہئے قطعہ نگاری کا تقاضہ یہی ہے۔ قطعہ نگاری میں شاعر کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس کا کلام غزلیت کا رنگ پیدا نہ کرے۔ الا اس حال میں کہ قطعہ بند اشعار وہ کسی غزل میں موزوں کرنے کو ہے'' [۳]

۱۔ فیروز اللغات فارسی ح۲،ص۲۲۲ ۲۔ انواع شعر فارسی، ص۷۹ ۴ ۳۔ کاشف الحقائق، ص۵۲۹

ان تمام تعریفوں کے باوجود قطعات عام طور پر مطلع کے ساتھ ہی موزوں کیے گئے ہیں اور اشعار کی تعداد بھی اکثر دو اشعار پر مبنی ہوتی ہے۔ چار اشعار یا اس سے زیادہ اشعار کے قطعات کی تعداد بہت کم ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا دبیرؔ اکثر قطعات مطلع کے ساتھ دو شعروں ہی میں موزوں کی گئے ہیں:

عیدِ نو روز عیدِ اکبر شد
جانشینِ رسولؐ حیدرؑ شد
عدل حیدرؑ به بین که از امروز
درجهاں روز و شب برابر شد[1]

مرزا دبیرؔ نے اس قطعہ میں ایک نادر مضمون نظم کیا ہے یعنی حضرت علیؑ کو رسول اکرمؐ نے جب مولا بنایا تھا تو ۱۸رذی الحجہ ہجری تاریخ ۲۱ مارچ شمسی تاریخ تھی۔ اور اس تاریخ ۲۱ مارچ کو عام طور پر دن اور رات برابر ہوتے ہیں یعنی ۱۲/۱۲ گھنٹے کے ہوتے ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے اسی دن کو مولائے کائنات کی عدالت کی مثال قرار دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں عید نوروز سب سے بڑی عید ہوگئی۔ بڑی عید اس لئے ہوئی کیوں کہ علی مرتضیٰؑ جانشین مصطفیٰ ہوگئے۔ اب عدالت حیدری ملاحظہ کرو کہ علی کے نیابت کے اعلان کی خوشی میں دن اور رات دونوں برابر ہوگئے۔

در جهاں عیدِ غدیر آمده دلشاد نمود
درسِ بلغ ز فلک شاهِ رُسلؐ یاد نمود
شُد امیرِ دوسرا حیدرؑ و با شیعهٔ او
ورد "اکملت لکم دینکم" ارشاد نمود[2]

مندرجہ بالا قطعہ بھی عید غدیر کے تعلق سے موزوں کیا گیا ہے۔ غدیر کے دن حضرت علیؑ کو رسول کریمؐ نے سب کا مولا قرار دیا تھا۔ غدیر کی اہمیت اس لئے ہے کہ اسی دن قرآن شریف نے دین کے کامل ہونے اور تمام نعمتوں کے نازل ہونے کا اعلان بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں محدثین نے بہت سی روایات نقل کی ہیں:

۱۔ مصحف فارسی، ص ۴۸ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۶۲

عن ابی هریره:لماکان یوم غدیر خمو هو یوم ثمانی عشرمن ذی الحجة قال النبیؐ : من کنت مولاه فهذا علی مولاه "فانزل الله الیوم اکملت لکم دینکم". ۱

عن زید ابن ارقم والبراء قالا: کنا مع رسول اللهؐ یوم غدیر خم و نحن نرفع غسن الشجرهة عن راسه فقال: الا ان الله ولیّ و انا ولی کل مومن من کنت مولاه فهذا علی مولاه، و فی غیر هذا الروایة اللهم وال من والاه و عاد من عاداه". ۲

زید بن ارقم عن النبیؐ قال: من کنت مولاه فهذا علی مولاه ". ۳

امام احمد بن حنبلؒ نے حدیث غدیر کو اپنی کتاب ''مسند'' میں بارہ مقامات پر نقل فرمایا ہے۔مسند احمد بن حنبل جلد ۱، ص۸۴، شمارہ،جلد ۱ص۸۸ شمارہ ۶۷۰، جلد ۱ص ۱۱۸ شمارہ ۹۵۰، جلد ۱ص۱۱۹ شمارہ ۹۶۱،جلد ۱ص ۱۱۹ شمارہ ۹۶۴، جلد ۱ص۱۵۲ شمارہ ۱۳۱۰، جلد۴ص۲۸۱ شمارہ ۱۸۵۰۲، جلد۴ ص۲۸۱ شمارہ ۱۸۵۰۳، جلد۴ص۳۶۸ شمارہ ۱۹۲۹۸، جلد۴ ص۳۱۰ شمارہ ۱۹۳۲۱، جلد ۴ص۳۷۲شمارہ ۱۹۳۴۴، جلد ۵ ص۴۱۹ شمارہ ۲۳۶۰۹۔امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ج ۷ص ۲۰۶ اور ۲۰۸ کتاب الرقاق میں حدیث غدیر کو نقل فرمایا ہے۔

شیعہ حضرات حضرت علیؑ کی ولایت کی بنا پر اس روز عید مناتے ہیں۔مرزا دبیرؔ نے وہی خوشی اس قطعہ میں بیان کی ہے کہ عید غدیر آ گئی تو دل شادمان ہو گیا۔ رسول کریمؐ کو جو"**یا ایها الرسول بلغ** " کے ذریعہ خدا نے حکم دیا تھا اس کی یاد تازہ ہو گئی۔آج کے روز علیؑ دونوں جہان کے مولا بنے لہذا خدا نے''**اکملت لکم دینکم**'' کے ذریعہ دین کی تکمیل کا اعلان کر دیا۔

۱۔الدرالمشور ص۳،ص۳۲۳ ۲۔شرح مذاہب اہل السنہ، ج۱،ص۱۰۴ ۳۔ترمذی، ج ۱۲ص۱۷۵، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب/باب مناقب علی ابن ابی طالب،ص ۲۳۷

بصد ثواب که عیدِ غدیر آمده است
گواه قدر جناب امیرؑ آمده است
علیؑ وصی نبیؐ شد ازیں سرور و طرب
برقص زهره صفت چرخ پیر آمده است [1]

خوشی کا مقام ہے کہ عید غدیر آ گئی ہے۔ یہ وہی روز ہے جو حضرت علیؑ کی قدر و منزلت کا گواہ بنا۔اس روز علیؑ وصی نبیؐ ہوئے تمام خوشی و شادمانی کے ساتھ لہذا چرخ بھی زہرہ کی مانند خوشی سے جھوم رہا ہے۔ملک الشعراء بہار اپنے قصیدے میں غدیر کے لئے لکھتے ہیں جس کا مطلع اور شعر مندرج ہے:

گر نظر در آیینه یکره بر آن منظر کند
آفرین ها باید آن فرزند بر مادر کند
گر دگر بار این چنین بیرون شود آن دلربای
خود یقین می دان که اوضاع جهان دیگر کند
داورش خوانده ولی و احمدش خوانده وصی
هم وصایت هم ولایت ز احمد و داور کند
در غدیر خم خطاب آمد ز حق بر مصطفیؐ
تا علیؑ را او ولی بر مهتر و کهتر کند
تا رساند بر خلایق مصطفیؐ امر خدای
از جهاز اشتران از بهر خود منبر کند
گرد آیند از قبایل اندر آن دشت و نبی
خطبه بر منبر پی امر خلافت سر کند
گوید آن کاو را منم مولا،علیؑ مولای اوست
زینهار از طاعت او گر کسی سر در کند [2]

۱۔مصحف فارسی،ص۶۳ ۲۔دیوان اشعار ملک الشعراء بہار،ص۳۹،۴۰

مرزا دبیرؔ کا قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

عیدِ نو روز بر تو میمون باد
بخت و اقبال تو همایون باد
دوستانِ علیؑ به عیش مدام
دشمنانش به رنج مقرون باد[1]

عید نوروز تیرے لئے اطمینان، سکون و راحت لے کر آئے۔ تیری قسمت اور تیرا جاہ و جلال بلند و بالا ہو۔علیؑ کے دوست، علیؑ کے چاہنے والے ہمیشہ خوش وخرم اور آباد رہیں اور ان کے دشمن بے چین، بےقرار، مضطرب اور پریشان حال رہیں۔

دهد خلق را مژده عیدِ غدیر
وصیِ نبیؐ شد جنابِ امیرؑ
ز تقدیر قدرِ علیؑ را بپرس
علیؑ علیٰ کل شیئ قدیر[2]

مذکورہ بالا قطعہ میں مرزا دبیرؔ نے جن صنائع کا استعمال کر کے خوبصورتی پیدا کی ہے ان میں تجنیس اور صنعت اشتقاق ہے۔''بحر الفصاحت'' میں صنعت اشتقاق کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

''صنعت اشتقاق یعنی کلام میں ایک اصل کے چند لفظ لانا اس طرح کہ ان لفظوں میں اصل کے حروف ترتیب وار موجود ہوں اور اصل میں جو معنی ہیں ان میں بھی باہم وہ اتفاق رکھتے ہوں''۔[3]

مذکورہ قطعہ میں تقدیر اور قدر حالانکہ ایک ہی مصدر سے مشتق ہیں لیکن معنی میں بہت اختلاف ہے۔اس میں'' تقدیر'' باب تفعیل سے مصدر ہے اور'' قدر''، فعل ہے۔شمس قیس رازی نے تجنیس کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

''الفاظ بیکدیگرمانند استعمال کردن است و آن چند

۱۔مصحف فارسی، ص۶۳ ۲۔مصحف فارسی، ص۶۴ ۳۔بحر الفصاحت، صفحہ ۱۲۰۱

نوع باشد تام و ناقص و زاید و مرکب و مزدوج و مطرف و تجنیس خط و همه پسندیده و مستحسن باشد در نظم و نثر و رونق سخن بیفزاید و آنرا دلیل فصاحت و گواه اقتدار مرد شمارند بر تنسیق سخن و لکن بشرط آنکه بسیار نکردد و بر هم افتاده نباشد و در بیتی دو لفظ یا چهار لفظ بیش نیایذ بتقسیمی مستوی. تجنیس تام آنست کی دو کلمه متفق اللفظ مختلف المعنی بکار دارد"۔[1]

نجم الغنی خاں رامپوری نے تجنیس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''صنعت تجنیس وہ ہے کہ دو لفظ میں مشابہ ہوں اور معنی میں مغائر اور اس کی قسمیں ہیں۔ تجنیس تام اور وہ یہ ہے کہ دو لفظ انواع حروف اور اعداد حروف اور ترتیب حروف اور حرکات و سکنات میں متفق اور معنی میں مختلف آئیں۔ پس اگر تجنیس کے دونوں لفظوں کی نوع علحیدہ ہو یعنی ایک اسم ہو ایک فعل ہو یا ایک اسم ہو اور ایک حرف یا ایک فعل ہو اور ایک حرف تو تجنیس تام مستوفی کہتے ہیں''۔[2]

مذکورہ قطعہ کے چوتھے مصرعہ میں اول ''علی'' اسم ہے اور دوم ''علی'' فعل ہے اور یہ تجنیس تام ہے۔ اس چوتھے مصرعہ کی خاصیت یہی ہے کہ مرزا دبیر نے آیت قرآنی کے ساتھ اسم علیؑ کو اس طرح موزوں کیا ہے کہ اسی کا جز نظر آتا ہے۔ عید غدیر نے زمانے کو یہ خوش خبری دی کہ علیؑ مرتضیٰ وصی مصطفیٰ ہو گئے۔ علی کے قدر و منزلت تقدیر سے معلوم کرو کہ علی تمام اشیاء پر قادر ہو گئے۔ ناصر خسرو اپنے قصیدے میں غدیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں جس کا مطلع اور شعر مندرج ہے:

۱۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم، ص ۳۳۸ ۲۔ بحر الفصاحت، صفحہ ۱۲۳۱

با خویشتن شمار کن ای هوشیار پیر
تا بر تو نو بهار چه مایه گذشت و تیر
بنگر که خلق را به که داد و چگونه گفت
روزی که خطبه کرد نبیؐ بر سر غدیر
دست علیؑ گرفت بدو داد جای خویش
گر دست او گرفت تو جز دست او مگیر[1]

الغرض مرزا دبیر نے جو غدیر کے حوالے سے موزوں کیا ہے ان کی عقیدت و محبت کا عکاس ہے اور اس سے پہلے بھی فارسی شعراء اس موضوع پر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ا۔ دیوان ناصر خسرو، قصیدہ شمارہ نمبر ۹۶

قطعات تاریخ

رباعی کے بعد سب سے مشکل ترین مگر تاریخ وتمدن کے اعتبار سے اہم صنف سخن ''تاریخ گوئی'' ہے جو کہ رباعی ہی کی طرح ایرانی ایجاد ہے حالانکہ اس صنف سخن کا دار و مدار ''ابجدی نظام'' پر ہے۔ رباعی کہنے کے لئے تو مخصوص اوزان پر تھوڑی بہت مشق کے بعد کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے لیکن تاریخ گوئی وہ سخت ترین مرحلہ ہے جہاں صرف عروضی مہارت کافی نہیں بلکہ عروض کے ساتھ ساتھ ریاضی مہارت تاریخی آگاہی اور تہذیب وتمدن سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اکثر تذکروں میں تاریخ گوئی کا ملکہ رکھنے والے شاعروں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر کسی بادشاہ یا شاعر یا کسی ادیب کی تاریخ ولادت یا تاریخ شہادت یاد رکھنے میں دشواری ہوتی ہے لیکن اگر وہی تاریخ شعر میں ہوتو بہت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ نظم اور نثر میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ نظم زود اثر ہوتی ہے نثر کے مقابلے۔ نظم کا اثر ذہن و دل پر دیر تک باقی رہتا ہے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی کے مطابق:

> ''تاریخ گوئی پر جتنا کام ہونا چاہئے تھا اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکا ہے۔ اردو تاریخ گوئی کے حوالے سے البتہ چند کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن فارسی تاریخ گوئی پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا''۔[1]

رباعی یا دیگر اصناف کی اپنی اپنی ہیئت ہے لیکن تاریخ گوئی کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں بلکہ یہ تمام اصناف سخن میں کہی جا سکتی ہے۔ بقول پروفیسر عراق رضا زیدی:

> ''ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس فن کا رشتہ ہر صنف سخن سے ہے۔ شاعروں نے قصیدے، قطعے، رباعی اور مثنوی جیسی اہم اصناف میں اس فن کا مظاہرہ کیا ہے''۔[2]

۱۔ فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت، ص ۷ ۲۔ ایضا

مادہ تاریخ کے سلسلے میں ڈاکٹر منصور رستگار فسای رقمطراز ہیں:

''مادہ تاریخ شعری را می گویند که شاعر در شرح وقایع وحوادث مهم و موضوعات و پیش آمدهای جالب توجه و قابل ضبط مانند ولادت، مسافرت، مرگ اشخاص بزرگ و جلوس سلاطین و وزراء و امرا بر مسند سلطنت و وزارت و امارت و بنای کاخهای با شکوه و مساجد و پلها و کاروانسراها و اماکن خیریه و تالیف کتب و تدوین دواوین و دیگر موضوعات ساخته و تاریک وقوع آنرا نیز اعم از صریح یا به صورت حساب جمل در پایان مقال ذکر کرده است''. ۱

صنعت تاریخ کی تعریف صاحب بحر الفصاحت نے ان الفاظ میں کی ہے:

''صنعت تاریخ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا عبارت یا مصرع یا بیت ایسی تجویز کریں کہ اس کے مکتوبی حروف کے عددوں سے با حساب جمل سنہ اور سال کسی واقعہ، شادی یا وفات کے معلوم ہوں یا نکاح خواہ، تولیت فرزند یا تصنیف کتاب خواہ لڑائی یا بادشاہ کے جلوس یا کسی اور امر کے وقوع کا زمانہ سمجھا جائے۔ حروف مکتوبی کی قید اس لئے ہے کہ جو حروف لکھنے میں نہیں آتے ہیں انکے عدد محسوب نہیں ہوتے اور جو لکھے جاتے ہیں اگر چہ پڑھے نہ جائیں عدد ان کے لئے جاتے ہیں''۔۲

تاریخ گوئی حالانکہ مشکل فن ہے لیکن مرزا صاحب جیسے مشاق شاعر کو اس فن پر عبور حاصل تھا ثابت لکھنوی رقم طراز ہیں:

۱۔ انواع شعر فارسی، ص ۳۴۴ ۲۔ بحر الفصاحت، ص ۱۳۲۱

''تاریخ گوئی میں بھی مرزا صاحب کو کمال حاصل تھا۔ چند منٹ اکثر تاریخ کہہ دیتے تھے۔ ہزاروں تاریخیں کہی ہیں'' ۔[1]

مرزا دبیر کی فارسی رباعیات میں سے ایک رباعی ''صنف تاریخ گوئی'' سے متصف ہے۔اس کے علاوہ زیادہ تر قطعات ہیں۔سب سے پہلے رباعی کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کے بعد قطعات۔اس رباعی سے پہلے مرزا دبیر کے سفر کلکتہ کی روداد پروفیسر محمد زمان آزردہ کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

''مرزا دبیر کو آخر عمر میں ضعف بصارت کی تکلیف ہوگئی تھی۔ واجد علی شاہ اس زمانہ میں مٹیا برج کلکتہ میں تھے وہاں آنکھوں کے کوئی جرمن ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ وہ مٹیا برج میں بادشاہ کے مہمان تھے۔ واجد علی شاہ کے اشارے سے ان کے کسی رفیق نے مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ وہ اگر آجائیں تو آنکھوں کی تکلیف دور ہوگی'' ۔[2]

اس سے آگے کی روداد مولوی صفدر حسین نے ''شمس الضحیٰ'' میں تحریر کی ہے:

''واضح باد که هر گاه جناب مرزا دبیّر صاحب مغفور بضرورت قدح چشم به کلکته تشریف بردند مهمان حضرت بادشاه جمجاه اعاد الله ملکه گشته بکوٹهی نواب مونس الدوله مقیم شدند عرضداشت که بحضور سلطان عالم ابلاغ داشتند لوحش به این دستخط خاص مزین شد.

گر بسر و چشم من بیایی بر قلب نهم که کیمیایی.

۲۹/ ذی الحجه ۱۲۹۱ھ فقط واقعی که قدردانی حضرت بادشاه جمجاه به نسبت جناب مرزا صاحب زائد ازان است که به معرض تحریر در آید

۱۔حیات دبیر،ص ۲۸۰ ۲۔مرزا سلامت علی دبیر، حیات اور کارنامہ،ص ۱۵۰

مثل آنکه بمقام سلطان خانه مبارک و بمقام سبطین آباد مبارک هنگام ملاقات استقبال جناب ممدوح (مرزا دبیر) فرموده همراه خود بردند و نیز برای باز دید بجائیکه جناب ممدوح تشریف آوردند در مجلس بالای منبر قریب بست پنج بند که بتعریف جناب ممدوح نظم فرموده بودند بحضور ضاص و عام خواندند. دو مصرع ازان حواله قلم:

بچپن سے ان کے دام سخن میں اسیر ہوں
میں کمسنی سے عاشق نظم دبیر ہوں[1]

مختصر یہ کہ مرزا دبیر آنکھوں کا علاج کرانے کے سلسلے میں کلکتہ گئے تھے اور وہاں جا کر انہوں نے اپنی آنکھیں بنوائیں اوردوبارہ روشنی پا کر اس قادر الکلام شاعر نے شکر ادا کرتے ہوئے اوراس واقعہ کو یاد رکھنے کے لئے تاریخ نظم کی جس کے اعداد آخری مصرعہ سے برآمد ہوتے ہیں۔

﴿رباعی﴾

امداد علی گاه خفی گاه جلی است
بر من ز ازل عین عنایات ولی است
چون ماده دفع شد بگفتم تاریخ
چشم بدور عین اعجاز علیؑ است

(ماده)۵۰ - ۱۳۳۸ ۱۲۸۸ھ[2]

یہ تاریخ مرزا دبیر نے صنعت تخرجہ میں موزوں کی ہے۔اس رباعی کے تیسرے مصرعے میں ''**ماده دفع شد**''یعنی چوتھے مصرع کے کل اعداد میں سے مادہ کے اعداد کم کر دئے جائیں تو اصل تاریخ حاصل ہو جائیگی۔یعنی مادہ دفع شد کے دو معنی ہیں ایک تو یہی ہوئے کہ جب ۵۰

۱۔شمس الضحی،ص ۱۶۵،۱۶۶ ۲۔شمس الضحی،ص ۱۶۷

عدد مادہ کے کم کئے گئے تو تاریخ برآمد ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ جب مادہ فاسد دور ہوا تو آنکھوں کی پریشانی دور ہوگئی۔ اور اس میں صنعت ایہام بھی پائی جاتی ہے۔ "**المعجم فی معاییر اشعار العجم**" میں "ایہام" کی تعریف کے ذیل میں مذکور ہے:

> "**ایهام بگمان افگندن استو این صنعت چنان بود کی لفظی ذو معنیین بکار دارد یکی قریب و یکی غریب تا خاطر سامع نخست بمعنی قریب زود و مراد قایل معنی غریب باشد**". [۱]

مولوی نجم الغنی نے اس صنعت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "ایہام اس کو کہتے ہیں کہ ایک لفظ ایسا کلام میں واقع ہو جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کے ایک بعید کے اور سامع کا گمان معنی قریب کی طرف جائے اور شاعر کی مراد معنی بعید ہوں۔ معنی قریب سے مراد یہ ہے کہ وہ معنی اس مقام کے مناسب ہوں اور معنی بعید سے یہ مراد ہے کہ وہ معنی اس مقام کے مناسب نہ ہو لیکن ان کا مقصود ہونا باعتبار کسی قرینہ خفی کے ہو۔ [۲]

آغا محمد کاظم شیرازی ایہام کی تعریف اس طرح لکھتے ہیں:

> "ایہام is a figure in which a word or a phrase is used with a double meaning so that the hearer may mistake the intention of the speaker or when several meanings of the same word can be appropriately applied to it. This figure is also called توریہ but there is this difference between them that in ایہام a word or a phrase bears two

---

۱۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم، ص ۳۵۵ ۲۔ بحر الفصاحت، ص ۱۳۶۵

meanings one is قریب (or the usual meaning) and the other بعید (or the far fetched meaning) of which only the بعید is applicable to the right explanation while in توریہ a word or a phrase has two or more senses one apparent and the other cancelled or remote and all of which are applicable". [۱]

مرزا دبیر کی مشکل پسند طبیعت نے تاریخ گوئی میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ایک تو تاریخ گوئی خود ایک مشکل صنف سخن ہے اور پھر اس صنف میں زبر و بینہ اور بھی سخت ترین مشکل امر ہے۔ جس کا التزام مرزا دبیر نے اپنے ہم عصر و حریف لیکن عقیدت مند میر انیس کی وفات پر لکھے گئے تاریخی قطعہ میں کیا ہے اور مرزا دبیر نے اپنی عروضی مہارت کا مکمل استعمال کیا ہے:

﴿قطعه تاریخ وفات میر انیس﴾

داد خواهم یا غیاث المستغیثین الغیاث
از که دل مانوس گردد بی سخنور بی انیس
عبرةً للناظرین گردید افلاک و زمین
دیدنی نبود مه و خورشید و اختر بی انیس
وا دریغا عینی و دینی دو بازویم شکست
بی نظیر اوّل شدم امسال و آخر بی انیس
یادگارِ رفتگان هسیتم و مهمان جهان
چند روزه چند هفته بی برادر بی انیس

۱۔ Persian Rhetoric and Prosody, Page no 12

الوداع ای ذوقِ تصنیف الفراق ای شوقِ نظم
شد حواس خمسه و ده عقل ششدر بی انیس
پوست کنده موشگافانِ سخن گویند حیف
هر سرِ مو بر رگِ جانست نشتر بی انیس
اشک را ربطی بدامن بود لیکن اشک ما
رفته رفته رفت تادامانِ محشر بی انیس
بسکه در بزمم بسوزد داغ بربالای داغ
نیست جز طاؤسِ دل پروانه دیگر بی انیس
نیست ایامِ تماشای چمن اکنون که هست
دانۂ شبنم سپند و غنچه مجمر بی انیس
تازه مضمون نظم می فرمود در هر بحر شعر
چشمۂ چشمم شود هم چشمِ کوثر بی انیس
سال تاریخش بزُبز و بیّنه شد زیبِ نظم
طور سینا بی کلیم الله و منبر بی انیس

۵۷۲	۱۸۴	۴۱۴	۱۲۱
زبروبینه	زبرمیں	زبروبینه	زبرمیں

۵۷۲ + ۱۸۴ + ۴۱۴ + ۱۲۱ = ۱۲۹۱ سنہ ھ

درسنینِ عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچه طبعم بود محزون و مکدر بی انیس
"آسمان بی ماهِ کامل سدره بی روح الامین" ۹۲۹
"طور سینا بی کلیم الله و منبر بی انیس" ۹۴۵
۹۲۹ + ۹۴۵ = ۱۸۷۴ء [1]

---

[1] حیات دبیر، ج ا، ص ۱۰۷، ۱۰۸

مرزا دبیر کو میر انیس کی موت کا اس قدر رنج ہوا کہ ان کا کھانا پینا تک کم ہو گیا تھا۔ میر انیس کی وفات کا کتنا غم تھا اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا صاحب میر انیس کے انتقال کے بعد بمشکل تین مہینے ایک دن زندہ رہے۔ اور اپنے دلی تاثرات، قلبی جذبات، ظاہری و باطنی احساسات کو جامہ الفاظ پہنا کر "**فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن**" کی صورت میں قطعہ تاریخ موزوں کی۔ ارباب ادب، اہل فن، قدردانوں کے درمیان پیش کر کے فن تاریخ گوئی کو جلا بخشی اور اس مادہ تاریخ کی ردیف انیس کے نام کو قرار دیا۔ جسے بطور ترجمہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

اے استغاثہ کرنے والوں کی فریاد کو سننے والے میں تجھ سے فریاد کر رہا ہوں، میرا دل جس انیس سے مانوس تھا اور وہی میرا مونس و ہمدم نہ رہا۔ زمین و آسمان بھی دیکھنے والوں کے لئے عبرت بن گئے اب زمین و آسمان کے نظاروں میں وہ مزہ نہیں نہ سورج میں وہ چمک محسوس ہوتی ہے نہ چاند میں خنکی کا احساس ہوتا ہے نہ ستارے اپنی تابانی سے متاثر کر پا رہے ہیں جن کے لئے یہ سب جانے جاتے ہیں۔ ہائے افسوس وہ میرے دو برادر عینی و دینی جو میرے قوت بازو کی طرح تھے دونوں ہی مجھ سے جدا ہو گئے۔ برادر عینی نظیر لکھنوی اور برادر دینی میر انیس۔ بھائی قوت بازو ہوتا ہے جس سے حوصلہ بنا رہتا ہے جب بھائی بھائی سے جدا ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جسم کا کوئی حصہ کم ہو گیا ہو۔ اب تو میں صرف جانے والوں کی یادگار بن کر رہ گیا ہوں لوگ مجھے دیکھ کر جانے والوں کو یاد کرتے ہیں میں بھی چند روزہ مہمان ہوں اب میں بھی بے برادر و بے انیس زیادہ دن نہیں رہنے والا کچھ دن، کچھ ہفتے۔ شعر کہنے کا، جذبہ و احساس کو لفظی و نظمی جامہ پہنانے کا شوق ختم ہو گیا میرے حواس خمسہ اور عقل سب حیران و ششدر ہیں حواس اپنی جگہ ہیں نہ ذہن حاضر ہے اب بھائی اور انیس کے بعد سب کچھ بے کار لگتا ہے۔ میرے بدن کے بالوں کی نوک بھی اب انیس کے بغیر نشتر سی چبھتی ہے۔ آنسوؤں کا تعلق دامن سے ہے رومال سے ہے لیکن اب میرے آنسو انیس کی جدائی میں دامن کی سرحد پار کر کے حشر تک آ گئے۔ اب تو بزم میں بھی بیٹھنا بے سود ہے اب یہاں بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگتا

اب تو صرف دل ہی ہے جو انیس کی یاد میں پریشان ہے اور اس کے علاوہ یہاں کوئی پروانہ نہیں۔ اب تو چمن کی سیر کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں اب گلستان میں سیر کرنے میں کوئی لطف نہیں اس لئے کہ سپند کا منہ بھی بند ہے اور غنچہ بھی چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی انیس کی جدائی میں یہ حال ہوا ہے کہ غنچوں کا کھلنا نہ کھلنا برابر ہے۔

مرزا دبیرؔ کا یہ تاریخی قطعہ میر انیسؔ کے لئے سند کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ ہم عصر، ساتھی شاعر اگر تعریف کریں تو واقعاً اس تعریف کے معنی ہیں۔ وہ شاعر جسے عوام نے ہمیشہ حریف بنانے کی کوشش کی ہو۔ مرزا دبیرؔ فرما رہے ہیں کہ میر انیسؔ ہر ایک شعر میں ایک نیا مضمون باندھتے تھے ان کی ہر نظم میں نیا مفہوم ہوتا تھا اب انیس نہیں ہیں تو میری آنکھوں کا چشمہ، چشمۂ کوثر بن گیا ہے یعنی انیس کی یاد میں آنسو متواتر جاری ہیں۔ مرزا دبیرؔ نے میر انیسؔ کی تاریخِ وفات تاریخ گوئی کے مشکل ترین قاعدے ''زبر و بینہ'' میں موزوں کی ہے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی ''زبر و بینہ'' کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

> ''زبر و بینہ کا تعلق ابجد کبیر سے ہے۔ جس کے پہلے حرف کو زُبر اور باقی حرف یا حروف کو بینہ کہتے ہیں۔ اردو حرف کا لفظ زبر و بینہ کے لئے ملفوظ اردو بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً ''خا'' اس عربی حرف کو اردو میں ''خے'' تلفظ کیا جاتا ہے لہذا اس کے عدد ''۶۱۰'' لیے جا سکتے ہیں عربی تلفظ میں اس حرف 'خ' یعنی ''خا'' کے عدد ''۶۰۱'' ہوتے ہیں''۔[۱]

حیات دبیر میں ثابتؔ لکھنوی نے 'زبر و بینہ'' کی یہ وضاحت کی ہے۔

> ''زبر و بینه: دو لفظ ہیں۔ 'زبر' اس کو کہتے ہیں کہ ہر حرف کے نام کے اول حرف کا عدد لیا جائے۔ اور 'بینه' اس کو کہتے ہیں کہ ہر اسم حرف کے اول حرف کو چھوڑ کر باقی حروف کے عدد لیں اور'' زبر و بینه'' اس کو کہتے ہیں کہ شروع کے حرف کا عدد بھی لے

۱۔ مخطوطہ آدمی سینتھلی نمبر ۱۲، ص ۱۵

لیں اور باقی حروف کے عدد بھی لے لیں جیسے الف میں تین حروف ہیں 'الف، لام، ف' پس الف کا ایک ۱ عدد لیا اس کو 'زبر'' کہیں گے لام کے ۳۰ تیس اور ف کے ۸۰ اسی طرح کل ۱۱۰ عدد لئے اس کو بینہ کہیں گے اور تینوں حروف کے اعداد ایک سو گیارہ لے لیں تو اس کو'' زبر و بینہ''کہیں گے''۔[۱]

میر محمد صادق صفوی نے کتاب ''دبیر اور شمس آباد'' میں زبر و بینہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''زُبر یہ ہے کہ حرف کے نام کے پہلے حرف کا عدد لیا جائے اور بینہ یہ ہے کہ حرف کے نام کے حرف اول کو چھوڑ کر باقی حروف کے اعداد لیے جائیں۔ مثلاً حرف 'ل' کا نام لام ہے اس نام کا حرف اول 'ل' ہے جس کے عدد ۳۰ ہیں اور اس کے بعد کے حروف 'ا' اور 'م' کے جمعاً عدد ۴۱ ہوتے ہیں پس اگر حرف 'ل' کے عدد لئے جائیں تو زُبر ہے اور اگر ۴۱ عدد لئے جائیں تو بینہ ہے''۔[۲]

مرزا دبیر کے مذکورہ مصرع سے تاریخ کا استخراج اس طرح ہے۔

<u>طور سینا</u> زبر و بینہ ۵۷۲ <u>بی کلیم اللہ و</u> زبر میں ۱۸۴

<u>منبر بی</u> زبر و بینہ ۴۰۴ <u>انیس</u> زبر میں ۱۲۱

طا واو را سین یا نون الف بی کلیم اللہ و

۱۰ ۱۳ ۲۰۱ ۱۲۰ ۱۱ ۱۰۶ ۱۱۱=۵۷۲ ۱۲ ۱۰۰ ۶۶ ۶=۱۷۴

میم نون با را با یا ا ن ی س

۹۰ ۱۰۶ ۳ ۲۰۱ ۳ ۱۱=۴۱۴ ۱ ۵۰ ۱۰ ۶۰=۱۲۱

۵۷۲+۱۸۴+۴۱۴+۱۲۱ = ۱۲۹۱ سنہ ھ

۱۔ حیات دبیر باب ۶، ص ۱۰۹ ۲۔ دبیر اور شمس آباد، ص ۷۸

قطعہ تاریخ ابواب المصائب

مرزا سلامت علی دبیر نے اپنی جوانی کے ایام میں ایک کتاب اردو نثر میں تحریر کی۔ جس کا مقصد مجلس عزا میں ذکر اہلبیتؑ کرنا تھا۔ چونکہ مرزا دبیر نے اپنی زندگی کو محمدؐ و آل محمدؐ کے فضائل و مصائب کو بیان کرنے کے لئے وقف کر دی تھی۔ حصہ نظم میں مرزا دبیر کے مراثی، رباعیات، سلام و نوحہ جات مقبول عام ہیں لیکن حصہ نثر میں مرزا صاحب کی تصنیف کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ محققین نے اس کتاب پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے بھی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب عوام تک باقاعدہ طور پر نہیں پہنچ سکی۔ مرزا دبیر کی اولین سوانح حیات جوان کی زندگی میں ہی شائع ہوئی اس میں ''ابواب المصائب'' کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین نے ''نادرات مرزا دبیر'' کے نام سے جو آثار دبیر یکجا کئے ہیں ان کی خاصیت یہی ہے کہ وہ غیر مطبوعہ ہیں یا ان تک عوام کی رسائی نہیں ہوئی۔ اسی کتاب کے مقدمے میں مصنف نے ''ابواب المصائب'' کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

> ''ایک مختصر کتاب حدیث کی "**ابواب المصائب**" کے نام سے بھی مرزا صاحب کی تصنیف ہے جو ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں مکمل ہوئی اس میں سورہ یوسف بیان کر کے جا بجا مصائب اہلبیتؑ سے ربط دیا گیا ہے تا کہ مجالس میں تاَل کار کے پہلو نکل سکیں''۔

ایسا لگتا ہے اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر سید صفدر حسین نے سوچے سمجھے لکھ دیا اور کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی ورنہ عیسوی تاریخ ۱۷۳۲ جو کہ مرزا دبیر کے سال ولادت ۱۸۰۳ء سے ۷۱ سال پہلے ہے اور ہجری تاریخ ۱۲۴۵ھ تو خود کتاب کے ابتدائی صفحات میں درج ہے اور مادہ تاریخ بھی تحریر ہے اس سب کے باوجود اتنی بڑی غلطی نہیں کرتے۔

ثابت لکھنوی نے حیات دبیر میں لکھا ہے:

''ابواب المصائب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کے عہد میں یہ کتاب مرزا صاحب نے لکھی۔ حضرت یوسفؑ کے واقعات جا بجا لکھ کر حالات امام حسین کا پیوند لگایا ہے۔ زبان سلیس ہے عبارت میں اس زمانہ کی روش کے موافق فارسی و عربی کے الفاظ بہت ہیں مگر عبارت کو خواہ مخواہ مقفی نہیں بنایا ہے اس لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے''۔[1]

پروفیسر محمد زماں آزردہ کے قول کے مطابق ''ابواب المصائب'':

''دبیر نے اردو نثر میں ایک مستقل تصنیف'' ابواب المصائب'' یادگار چھوڑی ہے جو کئی اعتبار سے اردو نثر کی تاریخ میں اہمیت کی مالک ہے اور لکھنو کے نثری دبستان کے مطالعہ میں ناگزیر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب اردو نثر کے محققوں اور ناقدوں کی نظروں سے اوجھل تھی۔ کیوں کہ اردو نثر کی تاریخ کے اولین دور کے بیان میں ابواب المصائب کا ذکر نہیں ملتا''۔[2]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ''اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ'' کے زیر عنوان ابواب المصائب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''دبیر نے نثر میں ابواب المصائب'' کے نام سے ذاکری کی ایک کتاب تصنیف کی تا کہ یہ فریضہ نظم کی طرح نثر میں بھی ادا کریں۔ یہ کتاب مرزا صاحب نے عہد شاہ نصیر الدین میں تصنیف کی تھی اور اس کی تاریخ بھی خود ہی نکالی ہے۔

ع۔ مصحف طاق چشم اہل عزا ست۔

۱۔ حیات دبیر، ثابت لکھنوی، ص ۲۸۰ ۔۔۔ ۲۔ مرزا اسلامت علی دبیر، ص ۴۴۶

یہ کتاب ۱۸۷ صفحات پر شائع ہوئی تھی اور اردو نثر کی ابتدائی کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب ذاکری کے اس طریقے سے تعلق رکھتی ہے جسے نثر خوانی کہتے ہیں۔ اس لئے اس میں جگہ جگہ اشعار بھی نثر کے ساتھ چسپاں کئے گئے ہیں جو نثر خوانی کا دستور ہے۔ کتاب کی زبان عالمانہ اور رواں ہے۔ ادبیت کی چاشنی کافی ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کی تصنیف ہے جس عہد میں فسانہ عجائب لکھی گئی تھی تو اس بات کی داد دینی پڑتی ہے مرزا صاحب نے سادہ اور شستہ زبان استعمال کر کے اس زمانے کے رنگ کے برخلاف نثر میں بھی اپنی ایجاد پسندی کا سکہ قائم رکھا ہے۔ ابواب المصائب سورہ یوسف کی عام تفسیر ہے جس میں جگہ جگہ ربط مصائب دے کر اسے رقت آفریں بنا دیا گیا ہے''۔[1]

محققین کے مندرجہ بالا اقتباسات ابواب المصائب کی اہمیت و افادیت واضح کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے جو اس کتاب کی تاریخ نکالی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیں:

﴿قطعه تاریخ ابواب المصائب﴾

ای زهی این کتابِ حزنِ اثر — که مزّین بنام آلِ عبا ست
در معانی و لفظ هر ورقش — محضرِ خون سیّد الشهداً ست
سطرِ سطرش به جلوهٔ تاثیر — مدِّ آهِ جنابِ خیرِ نسا ست
هست عاری عبارت از اغراق — چون الف هست حرف حرفِ راست
در کتابِ زمانه این اوراق — یادگارِ دبیؔر بی سر و پا ست
چون به لطفِ ائمّه گشت تمام — این همین لطف خضرٌ منزل ماست
غور کردم بسالِ تالیفش — که زآئینِ فرقهٔ شعراست
ناگهان فوج فوج آمده عقل — از چپ و راست داد مژده راست

ا۔ اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ، پیام عمل دبیر نمبر ۷۷ء

گفت بامن کہ سالِ تاریخش

"مصحفِ طاق چشم اہلِ عزا ست"

(۱۲۴۵ ھجری)[1]

ابواب المصائب مرزا دبیر کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے یہ کتاب اردو زبان میں تحریر کی گئی ہے۔جیسا کہ اس کتاب کے نام سے واضح ہے اس کا موضوع مصائب آل محمدؐ ہے۔ در اصل یہ کتاب (روضہ خوانی) محرم میں مجالس پڑھنے کے لئے تصنیف کی گئی تھی اس لئے اس کی زبان بھی نہایت سادہ، آسان اور سلیس ہے۔ یہ کتاب مصائب و آلام کربلا بیان کرنے کی بنا پر اہلبیتؑ پیغمبر سے منسوب ہے۔اس کے ہر لفظ اور ہر معنی سے داستان کربلا ظاہر ہے۔ درحقیقت یہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا شہادت نامہ ہے۔اس کتاب کی اکثر مجالس میں شہزادی کونینؑ مادر حسنینؑ کی آہ و بکا کی تاثیر کا احساس ہوتا ہے۔درحقیقت یہ کتاب دبیر کے نثری اسلوب کی یاد تازہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیوں کہ دبیر کی شہرت ان کی شاعری کی بنا پر ہے جبکہ دبیر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہترین نثر نگار بھی ہیں۔خدا کی عطا کردہ توفیق ،اہلبیتؑ کا عشق، شہیدان کربلا سے دیوانگی کی حد تک محبت اس کتاب کی تکمیل میں اصل معاون و مددگار ہیں۔اور یہی ذوات مقدسہ دبیر کے لئے خضر منزل ہیں جن کی رہنمائی نے انہیں منزل مقصود تک پہنچا دیا ہے۔

تاریخ گوئی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ مصرع تاریخ میں کوئی ایک ایسا لفظ موجود ہو جو واقعہ کی نوعیت کی جانب اشارہ کرے۔عقد یا جلوس کی تہنیت یا بیماری و موت جس موقع سے کہی جائے اس کے مناسب لفظ اس مصرع تاریخ میں موجود ہو۔ جیسے مذکورہ قطعہ تاریخ کے اصل مصرع تاریخ میں لفظ ''مصحف'' کتاب کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

مصحف کے استعمال میں بھی ایک خاص فنکاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ چونکہ صحیفے خدا کی جانب سے انبیاء علیہ السلام پر نازل ہوا کرتے ہیں اس میں الٰہی احکام و فرامین خداوندی ہوتے ہیں۔خدا کے مقربین کا ذکر ہوتا ہے۔لہٰذا تاریخی اعتبار سے لفظ ''مصحف'' کا اطلاق اسی کتاب

---

[1] مصحف فارسی، ص۶۹

پر ہوگا جو الٰہی فرامین وقوانین پر مبنی ہو یا اس کے مقربین کے ذکر خیر سے پر ہو۔ چونکہ یہ کتاب'' ذکر سید الشہداء و اہلبیت علیہم السلام'' کے لئے مخصوص ہے لہذا 'مصحف' کا استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔یعنی یہ کتاب صحیفے جیسی ہے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنی تصنیف ''فانی کشمیری کی مثنویات کا تنقیدی جائزہ'' میں مثنوی معنوی و شاہنامہ فردوسی کے سلسلے میں لکھا ہے:

> ''جیسا کہ مولانا جامی نے مثنوی معنوی کو''ہست قرآن در زبان پہلوی'' سے تعبیر کیا ہے اور مولانا حالی نے شاہنامہ فردوسی کو''قرآن عجم'' کہا ہے۔[۱]

مصرع کے اعداد اس طرح واضح کیے جا سکتے ہیں جس سے **مصحف ۲۱۸** + **طاق ۱۱۰** + **چشم ۳۴۳** + **اہلِ ۳۶** + **عزا ۷۸** + **ست ۴۶۰** = ۱۲۴۵ھ سال تکمیل کتاب ''ابواب المصائب'' حاصل ہو جاتا ہے۔

انسانی زندگی میں علم نجوم کی خاصی اہمیت ہے۔ بلکہ آج بھی ہندو حضرات کے یہاں شادی بیاہ سے پہلے کنڈلی ملانے کا رواج ہے یعنی ستارے اور بروج ملا کر دیکھا جاتا ہے کہ دولہا اور دلہن میں کیسی ہماہنگی رہے گی، دونوں ساتھ ساتھ خوش رہ پائیں گے، ایک کو دوسرے کا ساتھ بھائیگا یا نہیں اور یہ تمام امور بروج اور سیارگان کی مدد سے طے پاتے ہیں۔قرآن کریم کے سورہ بروج میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

> ''**والسماء ذات البروج**'' قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔[۲]

دوسرے مقام پر ارشاد الٰہی ہے:

> ''**ولقد جعلنا فی السماء بروجاً و زینها للناظرین**''اور بہ تحقیق ہم نے آسمانوں میں نمایاں ستارے بنا دیے اور دیکھنے والوں کے لئے انہیں زیبائی بخشی۔[۳]

قرآن کریم میں دیگر مقام پر ارشاد الٰہی ہے:

۱۔مثنویات فانی کشمیری کا تنقیدی جائزہ ۲۔سورہ بروج، آیہ ۱ ۳۔سورہ حجر، آیہ ۱۶

''ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح و جعلنها رجوماً للشیاطین''۔ اور بیشک ہم نے قریب ترین آسمان کو (ستاروں سے) چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کو مارنے کا ذریعہ بنایا۔[۱]

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آسمان میں بروج ہیں اور برجوں میں منازل ہیں۔ سورج، چاند، ستارے سب اپنے اپنے محور پر گردش کرتے ہیں انہیں بروج کی تفصیل علم نجوم میں بیان کی جاتی ہے۔ علماء نجوم نے بروج اور سیارگان کی تقسیم اس طرح کی ہے:

نمبر شمار	اسمائے بروج	Names of Zodiacs
1	حمل	Aries
2	ثور	Taurus
3	جوزا	Gamini
4	سرطان	Cancer
5	اسد	Leo
6	سنبلہ	Virgo
7	میزان	Libra
8	عقرب	Scorpio
9	قوس	Sigittarius
10	جدی	Caprocorn
11	دلو	Aquarrius
12	حوت	Pisces

۱۔ سورہ ملک، آیہ ۵

اسمایے ستارگان: زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد، قمر

انہیں بروج و ستارگان کے ذریعہ عقد میں فریقین کی ہماہنگی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مرزا دبیر نے مشتری کو دولہا کی جگہ اور زہرہ کو دلہن کی جگہ رکھ کر تاریخ نظم کی ہے جس سے ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مرزا دبیر کا یہ قطعہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء کے اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔

قطعہ عقد دختر محسن الدولہ بھادر

۱۲۷۶ ہجری مطابق ۱۸۶۰ء

ای جنابِ فلک ایوان کواکبِ دربان
نیّر اعظم برج شرف فضل و کرم
نام نامی بذل داد صلای احسان
محسن الدّوله بهادر شده بر لوح قلم
باغ باغ ست ته خلق تو جاں لیک زرشک
داغ داغ ست ز لاله چمنستانِ ارم
لفظ احسان شده از اسم شریفت ایجاد
آئینه گزر سکندر بود و جام زخم
مدعای زر و سیم این بود از موجودات
که به سائل رسد از دست تو دینار و درم
شد ثنای کرمت ورد زباں ها چندان
صیّت احسانِ تو پیچیده چناں در عالم
که زابکم شنو دگر بودش بعد بعید
بانگِ شکرانه احسان ترا گوش اصم

محفل آرا چو شدی ای پیٔ عقد دلبند
ناخن فِیض تو شد عقدۂ باقامت خم
نیست این کاهکشان چرخ زآتش بازی
برده گل ریز پیٔ هدیۂ عرشِ اعظم
رونق افزا شده در بزم سلیمان بلقیس
باهزاران شرف و جاه بصد اوج و حشم
سالِ این عقد ز زهره بحروفِ منقوط
مشتری گفت "ببین شد مه و خورشید بهم"

(۱۲۷٦ هجری مطابق ۱۸٦۰ء) [1]

مرزا دبیر نے یہ قطعہ تاریخ محسن الدولہ بہادر کی صاحبزادی کے عقد مسنون کے پر مسرت موقع پر بطور تہنیت موزوں کیا تھا۔ اور اس تاریخ کی خاص بات یہ ہے کہ مرزا دبیر نے جن ستاروں کے نام کا استعمال کیا ہے اس سے مرزا دبیر کے علم جفر (نجوم) سے نہ صرف واقفیت بلکہ دقیق نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مرزا دبیر نے جن ستاروں کے اسماء سے اس تاریخ میں استفادہ کیا ہے ان کی خاصیت اور پہچان مسرت و شادمانی ہے۔ مشتری و زہرہ دونوں سیارے سعد اکبر گنے جاتے ہیں اور اعمال حب کے لئے خاص اثر رکھتے ہیں۔ محبت کے تمام عملیات زیادہ تر انہیں دو سیاروں کے اوقات میں سرانجام دئے جاتے ہیں۔ مشتری Jupiter مرد سے متعلق ہے اور زہرہ عورت سے ۔ لہذا مرد کی تسخیر مطلوب ہو تو مشتری کی ساعت میں عمل کیا جاتا ہے اور اگر عورت کو تسخیر کرنا ہو تو زہرہ کی ساعت میں عمل کیا جاتا ہے۔ علماء نجوم نے ان سیاروں کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں:

''مشتری سعد اکبر ہے ویسے تو اس سیارے کے اوقات فراخی رزق کے لئے مجرب ہیں لیکن حب کے لئے یہ خاص اثر رکھتا ہے۔ زہرہ کو

[1] مصحف فارسی، ص ۷۰، ۷۱

عاملین نے خاص طور پر محبت کا نمائندہ قرار دیا ہے یہ ستارہ اعمال
حب کی تاثیر بڑھانے میں سب سے اولی ہے''۔[1]

جو لوگ علم جفر سے واقف ہیں وہ اس نکتہ سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مرزا دبیر نے کس باریک بینی سے کام لیا ہے۔اس میں مشتری سے دولہے کی جانب اور زہرہ سے دلہن کی جانب اشارہ کیا ہے۔دوسرے یہ کہ مرزا دبیر نے مصرع اول میں تاریخ کی صنعت کا خود نام بیان کر دیا ہے۔اس تاریخ کے مصرع ثانی میں آپ نے جو حروف منقوطہ استعمال کئے ہیں انہیں سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔یہ تاریخ گوئی کی شرط شمار کی جاتی ہے آپ شعر میں یا مصرع میں تاریخ کی نوعیت کی جانب اشارہ فرما دیں جو مرزا دبیر نے واضح الفاظ میں کیا ہے۔یعنی مصرع اولی کا مفہوم ہے اس عقد کا سال مشتری نے یعنی دولہا نے زہرہ سے یعنی دولہن سے کہا کہ حروف منقوطہ سے تاریخ نکل رہی ہے۔

سالِ ایں عقد ز زہرہ بحروفِ منقوط
مشتری گفت "ببین شد مہ و خورشید بہم"

تاریخ کا استخراج اس طرح ہے۔(ب۲ + ب۲ +ی۱۰ + ن۵۰ + ش۳۰۰ + خ۶۰۰+ ش۳۰۰+ی۱۰+ ب ۲=۱۲۷۹)

مسجد، خانہ خدا ہے اس کی تعمیر و تزئین میں بے حد ثواب ہے اکثر مخیّر حضرات مساجد وغیرہ کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔انہیں مخیّرین میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اس کار خیر کو پوشیدہ رکھ کر عبد و معبود کے درمیان کا معاملہ بنا لیتے ہیں جس میں کسی غیر کی کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔اور کچھ مخیّر افراد اس نیت سے اپنے کار ہائے خیر کو عوام پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے دیگر افراد بھی راغب ہوں۔عوام کو اپنے ان نیک کاموں کی خبر دینے کے لئے الگ الگ راستے اختیار کیے جاتے ہیں جس میں نام کندہ کرا کر لگا دینا یا اپنے نام پر مسجد کا نام رکھنا۔انہیں طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ مسجد کی بنیاد گزاری کی تاریخ نکالی جائے جس میں مخیّر کا بھی ذکر ہو جاتا ہے اور تاریخ بھی محفوظ ہو جاتی ہے۔مرزا دبیر نے بھی

---

[1] علم نجوم کی افادیت، ماخوذ از انٹرنیٹ، ویب سائٹ ایڈریس:www.roohanialoom.com

عظیم آباد کی ایک مسجد کی تاریخ نکالی ہے۔

قطعہ تاریخ مسجد عظیم آباد

خلیل خلق تبارک علی مبارک پی
امین و متقی و مولوی و نیک نهاد
ز روی مرتبه سر رشته دار دیوانی
سعید و پاک سرشت و مطیع رب عباد
پی عبادت معبود چون به نیّت صدق
ز خوش نهادی خود این بنای سعد نهاد
چه خوش ز روی ثنا گفت عقل تاریخش
که جاودان بود این مسجد عظیم آباد
دبیؔر سال بنا خواست از مؤذن عقل
که حسب رسم کند زیب دفتر ایجاد
بگفت از ته محراب اذانِ تاریخش
که "جاودان بود این مسجد عظیم آباد"

۱۲۸۸ھ [1]

فارسی اور عربی زبان پر عبور ہونے کی بنا پر مرزا دبیؔر تاریخ گوئی کے ماہر تھے۔ مرزا دبیؔر اکثر تاریخ کے کئی مادے تلاش کر کے بڑی خوبی سے تاریخ نظم کرتے تھے۔ مرزا صاحب کے زمانے میں فارسی تاریخ گوئی کا رواج عام تھا لیکن عربی میں اتنی تاریخ نہیں کہی جاتی تھیں ۔ مرزا صاحب عربی میں بھی بہت آسانی سے تاریخ نظم کرتے تھے۔ اس کا بین ثبوت مذکورہ قطعہ ہے جس میں آپ نے جہاں فارسی میں مختلف مصرعوں میں تاریخ نظم کی ہے وہیں عربی میں بھی تاریخ نظم کی ہے۔ مرزا صاحب کو صنعتوں پر بھی مکمل عبور تھا اس سلسلے میں ثابت لکھنوی لکھتے ہیں:

۱۔ مصحف فارسی، ص ۳۷

''جب مرزا صاحب کو سلیس نظم پر اور زبان پر مشق و قدرت ہوگئی اور معلومات بھی بڑھ گئیں تو صنائع و بدائع کی جانب متوجہ ہوئے اور اس بات کا خیال رکھا کہ ایسے اشعار بے تکلف حتی الامکان ہوں''۔[1]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرزا دبیرؔ کے صنعتوں سے استفادہ کی جانب اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

''مرزا صاحب کے مراثی کی بدولت اردو تقریباً ان تمام صنائع و بدائع سے مالا مال ہوگئی جو عربی و فارسی کا طرہ امتیاز تھی''۔[2]

مرزا دبیرؔ نے صنعت منقوطہ کے بعد صنعت غیر منقوطہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جو محال نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے اس صنعت میں طبع آزمائی کے لئے موزونی طبع کے ساتھ ساتھ الفاظ کی ندرت و خاصیت اور ان کے خواص سے واقفیت لازمی امر ہے۔ یہ قطعہ تاریخ خاصہ طویل ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر مصرع سے تاریخ برآمد ہوتی ہے:

شکر لله چه بهار است دبیرؔ
گل مقصد بکنار است دبیرؔ
نقش بند چمن هر موجود
چمن آرای گلستان وجود
ای دبیر فلک عقل دبیرؔ
سال تاریخ کن اکنون تحریر
سال تاریخ چو تضمین کردم
نظم دو مصرع رنگین کردم
"باگل ای باد صبا مژده دهی" ۲۳۹
"داد طوبی ثمر روز بهی" ۱۰۰۷
۲۳۹+۱۰۰۷=۱۲۴۶ھ

ا۔ حیات دبیر، ص ۱۵۹ ۲۔ دبستان دبیر، ص ۱۵۲

سال تاریخ هر مصرع بتاریخ و تجمع نمودن حروف اول و آخر مصاریع ماده تاریخ

افزود پی افضل ملک اوج طلوعی ۱۲۴۶
با جلوه هلال فلک عزت و تمکین ۱۲۴۶
حق عمر درازش کند و صاحب اقبال ۱۲۴۶
داد از سر امداد دعا خوب سقیه این ۱۲۴۶
اقبال نشان سلمه الله تعالی ۱۲۴۶
این گفت و بر مدم سر اعدای بد آمین ۱۲۴۶
با دولت اقبال ابدتا صد و سی سال ۱۲۴۶
دارای جهان صاحب نوبت شود امین ۱۲۴۶
تا روز ابد کوکب جاهش بسر اوج ۱۲۴۶
از اوج بود فرق سر دشمن پر کین ۱۲۴۶
تصنیف نمودم همی قطعه که الحال ۱۲۴۶
طباع بعالم شوم و لایق تحسین ۱۲۴۶
بداد دست خدا در کف صلابت جنگ ۱۲۴۶
ز بحر فیض در دولت و خوش اقبالی ۱۲۴۶
دبیؔر مصرع تاریخ گفت در عربی ۱۲۴۶
بقائُهٗ ابداً مد ظله العالی ۱۲۴۶
دبیر گفت بیک مصرعی دو تاریخش ۱۲۴۶
زهی به جاه قوی طالع و مظفر بخت ۱۲۴۶

قطعہ بی نقط

در طالع ممدوح سرور آمده کامل
در داد الهه دوسرا گوهر آمال

مملوک امام دوسرا کودک مه رو
کرد سر او هاله مه در همه احوال
دل حور ارم داد در الحاح و دعا کرد

داور	سر هر ماه	دهد عمر	دوو صد سال	۱۲۴۶
۲۱۱	۵۱۱	۳۲۳	۲۰۱	۱۲۴۶

مادہ تاریخ از کلام الهی جل جلاله

افوضُ	امری	الی	الله	۱۲۴۶
۸۸۷	۲۵۱	۴۱	۶۷	۱۲۴۶ھ [۱]

مذکورہ قطعہ میں مرزا دبیر نے اپنی تاریخ گوئی میں مکمل مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک ہی قطعہ میں صوری تاریخ بھی نظم کی ہے مہملہ تاریخ بھی، فارسی تاریخ بھی نظم کی ہے اور قرآنی تاریخ بھی۔ جس سے مرزا صاحب کی فارسی وعربی دونوں زبانوں پر دسترسی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مصحف فارسی، ص ۷۷ تا ۸۵

نوحہ

نوحہ یعنی بکا، گریہ، بین، آہ و زاری، مرنے والے کے صفات بیان کرکے آہ و زاری کرنا۔ مرثیہ ہی کی طرح نوحہ (صنف سخن) بھی حضرت محمد مصطفیؐ اور ان کی آل پاک پر گزری ہوئی مصیبتوں، غم و آلام بیان کرکے ان پر گریہ و بکا کرنے سے مخصوص ہوگئی ہے۔ نوحہ ایک حزنیہ نظم ہے جس کی اولین شرط رثائیت ہے۔ نوحے میں اہلبیت اطہار علیہم السلام کے مصائب بیان کئے جاتے ہیں۔ نوحے نے بھی سلام و مرثیہ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے۔ نوحہ وسلام میں ہیئت کے اعتبار سے مماثلت ہے یعنی لفظی پیکر و نظمی ہیئت میں یکسانیت ہے۔ لیکن اصل موضوع میں بہت فرق ہے۔ یعنی سلام کا مطلع اور اس کے اکثر اشعار فضائل پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن نوحے کا مطلع اور تمام اشعار بین و بکا سے پر ہوتے ہیں۔ جریدہ ''اشارہ'' کے نوحہ نمبر میں سلام و نوحے کے اس فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے:

> ''ویسے تو نوحہ وسلام کا ظاہری رنگ و روپ بادی النظر میں یکساں دکھائی دیتا ہے اور دونوں میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے مگر دراصل دونوں میں کافی فرق ہے اور اس فرق کو نظر انداز کرنے والے کامیاب نوحہ گو نہیں کہے جا سکتے۔ سلام کا بیشتر مواد مدح پنجتن و شہدائے کربلا کے صبر و شجاعت و فضائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر نوحے میں صرف کربلا میں ڈھائے گئے مظالم، اہل حرم کی بیکسی، اطفال

حسینی کی درد و تڑپ اور امام حسین کی مظلومی کا المناک، غمناک، غم انگیز مؤثر بیان ہوتا ہے۔ نوحہ سادہ اور سہل الفاظ کا متقاضی ہوتا ہے۔ نوحے کی زمین آسان و غمناک ہونا چاہئے۔ ۱؎

نوحے کے سلسلے میں ڈاکٹر سید رضا کاظم تقوی رقمطراز ہیں:

''نوحہ کسی کی موت پر اس کے چاہنے والے اس شخص کے مختلف اوصاف کا تذکرہ کر کے جو بین کرتے ہیں وہی نوحہ ہے۔ نوحہ کسی مرنے والے سے اظہار عقیدت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ نوحہ اور مرثیہ اگر چہ ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں دونوں ہی اصناف میں کسی مرنے والے کے اوصاف کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ مرثیہ میدان جنگ میں لڑ کر جان دینے والے کا تذکرہ مکمل طور پر کرتا ہے جبکہ نوحے میں اختصار ملحوظ خاطر رہتا ہے نوحوں کے لئے نہ تو بحریں معین ہیں اور نہ ردیف و قافیہ کی کوئی شرط نوحے، سلام کے انداز میں کہے جاتے ہیں ان میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر نوحہ بینیہ ہو۔ نوحوں میں اگر بین نہ ہو تو وہ نوحے کے بجائے سلام کی حد میں جاتے ہیں۔ ۲؎

مرزا دبیر نے جس طرح مراثی و سلام وافر مقدار میں کہے ہیں اسی طرح نوحہ جات کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ مرزا دبیر کے سلام و نوحہ جات کے مطالعہ سے سلام و نوحہ کا فرق بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ جریدہ ''اشارہ'' میں سلام و نوحہ کے فرق کو کس خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

مرزا دبیر و میر انیس کے زمانے میں یہ رواج تھا کہ مرثیہ پڑھنے سے پہلے رباعی و سلام سنانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مرثیہ گو پہلے ایک رباعی پڑھ کر سامعین کے حسن ذوق کو ابھارتا پھر سلام پیش

۱۔ اشارہ محرم نمبر ص ۱۵ ۲۔ ذاکر لکھنوی حیات اور شاعری، ص ۱۱۶

کر کے مجلس کو اپنے ساتھ لے کر مجمع کو گوش بر آواز بنا کر اپنے فن
کا مظاہرہ کر دیتا۔ مجلس کے خاتمے کے بعد نوحہ خوانی ہوتی تھی
اس طرح سلام کو ہم بارگاہ ممدوح میں اذن دخول اور نوحے کو
رخصتی نامہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اول الذکر میں سلامی و مجرئی کا
استعمال عام تھا اور نوحے میں الوداع و خدا حافظ۔[1]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی تحریر فرماتے ہیں:

توریت میں مختلف انبیاء کے نوحوں کا وجود اس صنف سخن کی
قدامت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔[2]

نوحے کے تعلق سے مولانا مرتضی کا بیان ہے:

اردو ادب کی زندہ اصناف سخن میں غزل کے ہم دوش ایک مختصر المیہ
منظومہ اور اہم صنف ہے جسے ''نوحہ'' کہتے ہیں۔'نوحہ' عربی لفظ ہے
جس کے معنی ہیں میت پر رونا، بین کرنا۔ نوحہ و مرثیہ میں یہی فرق تھا
کہ اگر کوئی المیہ نظم فقط لکھی جائے یا عام طریقے سے پڑھی جائے تو
مرثیہ اور اگر فریاد و بکا کے ساتھ مخصوص مجمع میں پڑھی جائے تو نوحہ
تکنیک، ہیئت، اسلوب، زبان و بیان، روح و مفہوم کے لحاظ سے
دونوں میں کسی فرق کی نشاندہی مشکل ہے۔[3]

نوحے کے بارے میں پروفیسر سید مہدی جعفر کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''نوحے کے تخلیقی آغاز ہی سے اختصار کی شکل میں 'نوحیت'
یعنی بین اور غم و الم کا اثر انگیز برتاؤ مرثیے اور نوحے کے
درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے۔ یہی اس کی فنی جہت ہے۔
شاعر کا کمال اس نقطۂ عروج پر منحصر ہے کہ نوحہ سننے والے کا
دل سنگین اور غمناک صورتگری سے تڑپ اٹھے۔ تخلیق کار

۱۔ اشارہ محرم نمبر ص ۱۳ ۲۔ دبستان دبیر، ص ۲۰ ۳۔ الواعظ محرم نمبر ص ۳۸، مئی ۱۹۶۱ء

کیلئے یہ جانکاہ کوشش انگلیوں کو خون دل میں ڈبو لینے کے
مترادف ہے''۔[1]

نوحے کی سب سے اہم خصوصیت جس پر آج تک کسی نے غور
نہیں کیا وہ یہ ہے کہ یہ صرف عورتوں کے بین و بکا کا ترجمان
ہے۔(مرد کی زبانی نوحوں کے باوجود) اس کے تمام تر
جذباتی اظہار جو شدت غم اور گریہ سے معمور ہیں وہ صرف
عورتوں سے مخصوص ہیں۔مرثیہ چاہے جناب عباسؑ کے حال
کا ہو یا جناب علی اکبر، جناب قاسم اور علی اصغر کی شہادت کا
اس میں امام حسینؑ کی زبانی جو بین ہیں وہ اس وقت تک ہیں
جب تک شہداء کے لاشے مقتل میں ہیں۔ خیموں میں
لاشوں کے پہنچنے کے بعد سارا بین و بکا زینب وکلثوم، بانو ولیلی
اور جناب سکینہ کی دردناک آوازوں میں ڈھل کر نوحہ بن
جاتا ہے۔[2]

نوحے کے لئے کوئی خاص بحر، وزن، ہیت نہیں ہے بلکہ نوحہ ہر ہیئت میں کہا گیا۔ مسدس، مخمس، مربع، ترکیب بند، ترجیع بند، مثلث اور مستزاد سبھی ہیئت میں نوحے کہے گئے۔ خاص طور مستزاد میں نوحے لکھے گئے۔آج بھی نوحہ گوئی کے لئے کوئی قید نہیں ہے جس ہیئت میں جس بحر میں چاہیں نوحہ کہا جاتا ہے۔لیکن زیادہ تر غزل کی ہیئت میں نوحے لکھے گئے۔ چونکہ یہ آسان بھی ہے زود اثر بھی۔ غزل و نوحے میں مماثلت ہیئت کے علاوہ اس کے موضوع میں بھی ہے یعنی غزل میں غم دنیا، غم دوراں، غم جاناں بیان کیے جاتے ہیں اور نوحے میں غم کربلا، غم سید الشہداء علیہ السلام۔مرزا دبیر نے مرثیہ، سلام، رباعی و قطعات کی طرح نوحہ گوئی میں بھی کمال فن کا اظہار کیا ہے۔

۱۔اشارہ نوحہ نمبر ص۴۷ ۲۔اشارہ نوحہ نمبر ص۴۷

﴿نوحہ - ا﴾

زینب و حال تباهش نگرید گریهٔ شام و پگاهش نگرید
سینه اش ز آتشِ غم یکسر سوخت تا بزن شعله آهش نگرید
حلقه چون داغ زده در ماتم به عزاجامه سیاهش نگرید
پیش چشمش شده مذبوحِ حسین حسرتِ دل به نگاهش نگرید
شاهٔ بر چهره پریشان زلفش گرد مهِ ابرِسیاهش نگرید
تابزن در تتق ظلمتِ شام شفق خون‌رُخِ ماهش نگرید
بسرِ خاک نخون غلطیده باهمه رفعت و جاهش نگرید
هر که او بود پناهِ دو جهان کس نکرد آه پناهش نگرید
پاره پاره شده پیراهن تن از کتان جامهٔ ماهش نگرید
آن که می سود کُله گوشه عرش شمر بر بوده کلاهش نگرید
چه بود باعثِ قتلِ معصوم بی گناهیست گناهش نگرید
ناظرِ مهدیِ هادیست دبیر
چشم و ابرو سرِ راهش نگرید ؎

کسی بھی کلام کی مقبولیت میں اس کا مطلع سب سے زیادہ دخیل مانا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر مطلع ہی بے جان ہو تو سامعین کی توجہ مکمل طور پر نہیں ہو پاتی اور اگر مطلع جاندار ہو تو سامعین شروع ہی سے جڑے رہتے ہیں۔ خصوصاً نوحے کا مطلع جو ہر شعر پڑھنے کے بعد اکثر دہرایا جاتا ہے۔ اب اس نوحے کا مطلع دیکھئے۔ مرزا دبیر نے جو حسن تعلیل اس مطلع میں بیان کی ہے وہ قابل تقلید ہے۔ آسمانی شفق ایک قدرتی معاملہ ہے۔ کیونکہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں آسمان کی جانب بلند ہو جاتی ہیں جس وجہ سے آسمان کا رنگ سرخ نظر آتا ہے۔ لیکن مرزا دبیر نے آسمان کی اس سرخی کی الگ ہی علت بیان فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں زینب مضطر کے حال پر آسمان بھی بے حال ہے یعنی آسمان زینب کی حالت پر گریہ کناں ہے جس کی

ا۔ مصحف فارسی، ص ۹۴۔۹۵

وجہ سے اس میں سرخی نظر آ رہی ہے۔ اس سرخی کا سبب غم حسینؑ میں خون کے آنسو بہانا ہے۔ شدت گریہ سے اکثر آنسو سوکھ جاتے ہیں۔ جس کے بعد دم گھٹنے لگتا ہے جس کو خون کے آنسو سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ میر تقی میر نے کہا ہے ؎

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا [1]

روتے روتے دم سوکھ گیا ہے آنسو خشک ہو گئے ہیں حالت یہ ہے کہ کوئی آہ کی چنگاری شعلہ نہ بن جائے۔

غم حسینؑ میں سیاہ لباس پہنا جاتا ہے مرزا دبیرؔ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ کیونکہ شدت گریہ سے آنکھوں کے نیچے سیاہ داغ ہو جاتے ہیں یعنی یہ سیاہ داغ غم و گریہ کی زیادتی کی علامت ہیں اسی لئے سیاہ لباس پہننا بھی غم کی علامت ہے۔

دنیا میں بہن بھائی کی محبت سب سے زیادہ پاک و پاکیزہ اور بے لوث مانی جاتی ہے۔ اس لئے اگر بھائی پر کوئی پریشانی آتی ہے تو بہن پریشان ہو اٹھتی ہے اسے کسی پل چین نہیں ملتا۔ چھوٹی چھوٹی پریشانی میں بھائی کا ساتھ دینے والی بہن کے سامنے یا وہ بہن جو کبھی اپنے بھائی سے جدا نہ رہی ہو اس کے سامنے اس کے بھائی کے گلے پر خنجر چلایا جائے سر تن سے جدا کیا جائے تو بہن کس طرح برداشت کرے گی۔

نوحے کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں شاعرانہ فنکاری نہیں ہوتی ایسے افراد کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ مرزا دبیرؔ کے نوحوں کا مطالعہ کریں ان کے تمام شک و شبہات رفع ہو جائیں گے۔ اب اسی شعر کو لے لیجئے۔ مقتل میں امام حسینؑ کے چہرے پر زلف پریشان کی کیا خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ اس شعر میں غزل کا بھرپور رنگ موجود ہے۔ اس لئے کہ مرزا دبیرؔ نے امام حسین کے چہرے کو ماہ سے اور پریشان زلفوں کو ابر سیاہ سے تشبیہ دی ہے۔

نواسہ رسولؐ کا مرتبہ و مقام سب سے اعلی ہے اس کے بعد بھی ان کے ساتھ یہ ستم کیا گیا کہ آپ خاک پر خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جو دنیا والوں کے لئے بہترین پناہ ہے ہائے

۱۔ کلیات میر تقی میرؔ، ج۱، غزل ۷۸، ص۲۱۲

افسوس خود اسی کو پناہ نہ ملی۔ بدن کے زخموں کو کپڑوں کے ٹکڑوں سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح کپڑے پھاڑ دئے جائیں تو اس کا دھاگا اس کے کپڑے کا ریشہ ریشہ جدا ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح مظلوم کربلا کا بدن پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ معصوم کو قتل کرنے کی وجہ کیا تھی۔ کیوں بے خطا کو تہہ تیغ کیا اس لئے کہ بے گناہ کو ستانا بھی تو ایک گناہ ہے چہ جائی کہ اسے قتل کرنا۔ یہ تو اس سے بھی بڑھ کر گناہ ہے۔

انتظار کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ پلکیں، نظریں، ذہن، دل، دھڑکن سب راہ کی جانب متوجہ رہتی ہیں۔ یعنی آنے والے کے انتظار میں راستے پہ نگاہیں گڑی رہتی ہیں۔ اسی لئے بھی نظریں راستے پر جمی ہوئی ہیں کیونکہ وہ مہدی موعود کی منتظر ہیں۔

اس کے علاوہ مرزا دبیر کا ایک اور فارسی نوحہ ہے جس کی زمین، ردیف و قافیہ ایک ہی جیسا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے نوحے کا ہی جز ہے۔ اس نوحے میں مرزا دبیر نے پہلے کے مقابلے کچھ الگ مضامین نظم کئے ہیں۔ اس نوحے کے مطلع میں امام حسین کے مقام و مرتبہ کا ذکر کیا ہے اور اس انداز سے کیا ہے سر تسلیم خم ہونے کو اس کی دلیل بنایا ہے۔ کیوں کہ آج بھی نام حسینؑ سن کر سر خود بخود احترام کے لئے جھک جاتا ہے۔

خانہ کعبہ جو کہ بیت خدا ہے اس کو سیاہ غلاف کیوں چڑھایا گیا ہے۔ سیاہ لباس تو غم کی نشانی ہے خدا کے گھر کو کس کا غم ہے۔ شاعر کہتا ہے غلاف کعبہ کی سیاہی کا موجب غم حسینؑ ہے کعبہ کا غلاف سیاہ ہونا ثبوت ہے کہ کعبہ بھی شہ کا عزادار ہے۔ ع۔

اس واسطے پوشاک سیہ پہنے ہوئے ہے
سب جان لیں سرور کا عزادار ہے کعبہ[1]

﴿نوحہ - ۲﴾

درِ شبیرؑ و بجاهش نگرید　　　سرِ تسلیم گواهش نگرید
ماتمِ قبلۂ دین می دارد　　　کعبه و رخت سیاهش نگرید
عاشق روی پسر بود حسینؑ　　　سُوی اکبرؑ به نگاهش نگرید

۱۔ مخطوطہ نمبر ۱، یاسر رجیٹوی

نامِ شبیرؑ اثرها دارد — آه و ناله دو گواهش نگرید
عرش از نالۂ زهراؑ لرزید — شیعیان خاصۂ آهش نگرید
تن سر خاک و سرِ شه به سنان — مومنان حالِ تباهش نگرید
داغِ فرزند به قلب زهراؑ است — محضر و مُهر گواهش نگرید
چه بود باعثِ قتلِ معصوم — بی گناهیست گناهش نگرید
بود هفتاد و دو تن یار حسینؑ — فوج بیند و سپاهش نگرید
شهؑ دعا داد عطایش بینید — شمرِ بد کرد گناهش نگرید
ماند بی آبِ چها باغِ بتولؑ — خشک شد سبز گیاهش نگرید
تنِ زارش ز تفِ غم شد خشک — آتش افتاده به کاهش نگرید
نو گُلِ باغِ نبیؐ چون سبزه — گشته پامال براهش نگرید
شوکتِ خار و سنانش بیند — دی وطغیان سپاهش نگرید

زیرِ پای شهؑ مردانست دبیرؔ
تاج بیند و کلاهش نگرید[1]

جناب علی اکبرؑ ہم شکل رسولؐ تھے اسی طرح کا مضمون رباعی میں موزوں ہو چکا ہے جس میں امام حسینؑ نے فرمایا تھا کہ بیٹا جب بھی میں نانا کی زیارت کا مشتاق ہوتا ہوں تو تیرے چہرے کو دیکھ لیتا ہوں۔ علی اکبر سے امام حسینؑ کو نانا کی شباہت کی بنا پر بہت محبت تھی دوسرے جوان بیٹے کی چاہت بوڑھے باپ کے دل میں حد سے زیادہ ہوتی ہی ہے کہ جوان بیٹا بوڑھے باپ کی ضعیفی کا عصا ہوتا ہے۔ اس لئے جب علی اکبر میدان کارزار کے لئے نکلے تو امام حسینؑ بیٹے کو رخصت کرنے کے باوجود دور تک پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ظاہر ہے کہ باپ کا بیٹے کی جدائی برداشت کرنا آسان کام نہ تھا۔

کائنات میں ایسی دوسری کوئی جنگ نہیں ملتی جہاں لاکھوں کی فوج سے ۷۲ افراد نبرد آزما ہوئے ہوں اور جام شہادت نوش کر کے فتح و ظفر کی علامت بن گئے ہوں۔ مال و حکومت کے

---
[1] مصحف فارسی، ص ۹۱ تا ۹۳

لئے ہونے والی جنگوں میں مرنے والوں کی شکست اور زندہ رہنے والوں کی فتح ہوتی ہے لیکن کربلا کی جنگ نے جو انسانیت اور دین بچانے کے لیے بطور احتجاج لڑی جارہی تھی، تاریخ ہی بدل کر رکھ دی کہ مرنے والے جیت گئے اور قاتل خود ہی انہیں اپنے سے بلند کر کے لے گیا۔ جہاں دنیا نے دیکھا ایک سرتن سے جدا ہوکر قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے باطل کی شکست کا اعلان کر رہا ہے۔

حسین چاہتے تو یزید سے بیعت کر کے اپنی جان بچا سکتے تھے یا بیعت کر کے حکومت میں شریک ہو سکتے تھے لیکن حسینؑ مظلوم نے تخت و تاج کو ٹھوکر مار کر دین اسلام کو سہارا دیا۔ اسی لئے تو دبیر نے کہا تخت و تاج تو حسین کی ٹھوکروں میں پڑا ہے کیوں کہ حسین کو حکومت نہیں نانا کا دین پیارا ہے۔

☆☆☆☆☆

مرثیہ (ترجیع بند)-۱

اصناف سخن میں ایک صنف ترجیع بند بھی ہے۔جس کی تعریف اس کے نام ہی سے ظاہر ہے''ترجیع'' باب تفعیل سے ہے ترجیع کے حروف اصلی''رجع'' ہیں جس کے معنی ہیں پلٹنا۔ شعری اصطلاح میں کلام میں کسی ایک بیت کی تکرار، بار بار ہونا یعنی اگر مخمس یا مسدس ہے تو اس کے ہر بند کی بیت ایک ہی رہے گی یہی ترجیع ہے یعنی بیت کا پلٹ کر آنا۔کتاب''انواع شعر فارسی'' سے ترجیع بند کی تعریف نقل کی جا رہی ہے:

''ترجیع بند : مجموعه اشعاری است که در یک وزن ولی در قوافی مختلف سروده شده باشد و ساختمان آن به این شرح است که چند بیت بر یک وزن و قافیه بگویند و در پایان آن یک بیت مقفی بیاورند که با ابیات پیش در وزن متحد ولی در قافیه مختلف باشد و همچنان این عمل را چند بار تکریر کنند، بطوری که در فواصل همه بخشها بیتی منفرد آمده باشد. پس هر گاه یک بیت را در فواصل عیناً تکرار کرده باشندآن نوع شعر را 'ترجیع' یا ' ترجیع بند' و بیت فاصله را 'بند ترجیع 'یا 'بندگردان' گویند''۔[۱]

۱۔اوزان شعر فارسی، ص۴۳۰

جیسا کہ اقتباس سے واضح ہوگیا کہ چند شعر موزوں کرنے کے بعد ایک ہی بیت کی تکرار ہوتی رہتی ہے اسی لئے اس صنف کو ترجیع بند کہا جاتا ہے۔ مرزا دبیر نے فارسی میں تین ترجیع بند موزوں کیے ہیں۔ جن میں پہلا اور دوسرا ترجیع بند مرثیہ ہے پہلے مرثیہ کے ۴۷ بند ہیں اور جس کی بیت ہے۔

دُریگانۂ دریای مجمع البحرین

بخون طپیدۂ کرب و بلا امامِ حسینؑ

اس کے بعد دوسرے مرثیے (ترجیع بند) میں ۲۳ بند ہیں جس کی بیت ہے:

بلند مرتبه شاهی ز صدر زین افتاد

اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد

تیسرے ترجیع بند میں ۲۰ بند ہیں اور اس کی اساسی بیت ہندوستان کے اکثر امام باڑں کے دروازوں پر کندہ ہے:

بی ادب پامنه اینجا که عجب درگاهی ست

سجده گاه ملک و روضه شاهنشاهی ست

مرزا دبیر کا مذکورہ ترجیع بند حقیقت میں فارسی مرثیہ ہے۔ فارسی زبان میں مرثیہ کا کوئی مخصوص قالب یا مخصوص ہیئت نہیں ہے۔ اردو زبان میں بھی مرثیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں تھی۔ مرثیہ کی موجودہ و مروجہ ہیئت مرزا محمد رفیع سودا کی دین ہے جسے میر تقی میر، میر خلیق و میر ضمیر نے آگے بڑھایا اور ان ان دونوں کے شاگرد میر انیس و مرزا دبیر نے بام عروج تک پہنچایا۔ لیکن فارسی میں مرثیے کے لئے کوئی ہیئت مخصوس نہیں ہے۔ فارسی زبان کے مشہور شاعر محتشم کاشانی کا ''دوازدہ بند'' جس میں بارہ بارہ اشعار کا ایک بند ہے (اسی طریقے کے اس میں بارہ بند ہیں اسی لئے اس کا نام دوازدہ بند پڑا) بہت مشہور و معروف ہے۔

محتشم کاشانی کے بعد فارسی کا مشہور مرثیہ گو شاعر ملا مقبل اصفہانی ہے اس کے مراثی بھی

جداگانہ ہیئت کے حامل ہیں ۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ''تاریخ مرثیہ'' میں ملا مقبل اصفہانی کی مرثیہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے جو صفحہ نمبر ۱۴۹ سے ۱۶۴ تک محیط ہے۔ ان صفحات میں پروفیسر رضوی نے مقبل کے مراثی کے نمونہ پیش کیے ہیں۔ ان میں جو پہلا مرثیہ نقل کیا وہ ہیئت مثنوی میں ہے یعنی ہر شعر میں نیا قافیہ وردیف:

روایت است که چون تنگ شد بر او میدان
فتاد از حرکت ذوالجناح و از جولان
نه سید الشهدا بر جدال طاقت داشت
نه ذوالجناح دگر تاب استقامت داشت

[۱]

اسی طرح صفحہ ۱۵۴ پر ایک اور مرثیہ نقل کیا ہے یہ بھی ہیئت مثنوی میں ہے:

برای نوحه مرا پروریده است پدر
ز گریه شیر بمن داده دایه و مادر
فغان و ناله وصیت ز والدین من است
ادای تعزیه از والدین دین من است

[۲]

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں جو شعراء و ادباء ایران سے ہندوستان آئے ان میں ملا خطا شوستری ہے۔ مصحفی نے ملا خطا کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

مذکورہ اقتباس سے بات واضح ہوگئی کہ ملا خطا روضہ خوانی کرتے تھے۔ اور نظم و نثر پر بھی قادر تھے ۔انہوں نے ''بحر البکا'' تصنیف کی جس میں بیشتر مرثیے اور نوحے ہیں۔ ملا خطا ہندوستان میں آئے یہاں رہے یہیں انتقال کیا اور مراثی انہوں نے فارسی میں تحریر کئے وہ اس دعوی کو مضبوط کرنے کے لئے کافی ہیں کہ فارسی میں مرثیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے۔ پروفیسر مسعود حسن نے ملا خطا کے مرثیہ کے اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے چند یہاں

۱۔ تاریخ مرثیہ، ص ۱۴۹ ۲۔ تاریخ مرثیہ، ص ۱۵۴

نقل کیے جاتے ہیں:

محرم آمد و از سیل گریه احباب
بنای هستی عیش جهان رسید بآب
شد از معامله شورش اناث و ذکور
مجاوران فلک را گمان نفخه صور
پی تدارک ماتم برنگ طره آه
سپهر کرده ز سر تا بپا لباس سیاه
۱

مذکورہ اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فارسی میں مرثیہ کی متعین ہیئت نہیں ہے۔ بس اس میں رثائیت ہونا لازمی ہے۔ ''انواع شعر فارسی'' میں ''رثاء و سوگنامہ'' عنوان کے ماتحت مرثیہ پر گفتگو کی گئی ہے لیکن اس کی ہیئت پر کوئی گفتگو نہیں ملتی صرف مرثیہ کی تعریف بیان کی ہے:

''رثاء در لغت بمعنی گریستن بر مرده و ذکر نیکوئیهای اوست و رثائیه شعری است که در سوگ مرده سروده شود، مرده ای که ممکن است از بزرگان قوم و شهر و دیاری باشد یا از عزیزان و کسان و خویشاوندان شاعر و یا از پیشوایان دین و ائمه اطهار''.۲

اس کے بعد اسی کتاب میں ''رثاء مذہبی'' کے تحت تحریر ہے:

''رثاء مذهبی این نوع شعر که از عمر آن بیش از پنج قرن نمی گزرد، مخصوص ذکر مناقب ائمه اطهار و شرح واقعه جانسوز کربلا و خاص اهل تشیع می باشد

۱۔ تاریخ مرثیہ، ص۱۸۱ ۲۔ انواع شعر فارسی، ص۲۰۱

و ازحکومت صفویه در ادبیات فارسی رواج یافته
است. از شاعرانی که بدین شیوه سخن پرداخته اند
وصال شیرازی، محمود خان ملک الشعرا و از همه
مهمتر محتشم کاشانی است"۔[۱]

پورے اقتباس میں کہیں بھی ہیئت پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔لیکن چونکہ رثاء کے معنی ہی رونا، آہ و بکا کرنا، مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے گریہ کرنا ہیں اس لحاظ سے مرثیہ کا لازمی جز مصائب ہیں۔مرزا دبیرؔ کے مخاطب آسمان، زمانہ وغیرہ ہیں جن سے مکالمے کے ذریعے مصائب آل محمدؐ بیان کئے گئے ہیں۔مرزا دبیرؔ کا تمام کلام ہی اس قابل ہے کہ اس کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے لیکن یہاں چنندہ بندوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی جارہی ہے۔

نبیؐ ست بحرِ علوم و علیستؑ اورا عین
ز اتحاد ندارند فرق فی ما بین
دو بحر گشته بهم با هزار زینت وزین
چه حاصل آمد ازین اجتماع عین العین
دُرِ یگانۀ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدۀ کرب وبلا امام حسین
[۲]

پہلے ترجیع بند کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی اساسی بیت میں لفظ "دُر" کا استعمال ہوا ہے جس کی مناسبت سے اس کے ہم معنی الفاظ تقریباً ہر شعر میں کہیں مرجان، کہیں لعل، کہیں صدف، کہیں گوہر اور کہیں جوہر کا استعمال کیا ہے۔اس ترجیع بند کے پہلے ہی مصرع میں خاتم المرسلینؐ کی مشہور و معروف حدیث کا فارسی ترجمہ کیا ہے:

"قال رسول اللهؐ:انا مدينة العلم و علی بابها فمن اراد العلم

۱۔انواع شعر فارسی،ص۲۱۶ ۲۔مصحف فارسی،ص۱۷۴

فلیات الباب" رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں شہرِ علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں جسے علم چاہیے اسے دروازے سے ہونا ہوگا۔ [1]

جس کا مقصد علم، شہرِ علم اور بابِ شہرِ علم کی اہمیت بیان کرنا ہے یعنی جس میں علم و دانش کو عام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصرع ثانی میں رسول کریمؐ کی اس حدیث مبارک کی جانب اشارہ ہے جس میں آپ نے فرمایا میں اور علی ایک ہی نور سے ہیں۔ احمد ابن حنبل نے یہ روایت نقل کی ہے:

"**عن عمران بن حصین عن النبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم:**
علی منی و انا منہ وھو ولی کل مومن بعدی"، علی مجھ سے ہے
اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے بعد ہر مومن کا ولی ہے۔ [2]

مصرع اولی میں علم کی فضیت و اہمیت کو واضح کیا ہے تو دوسرے مصرعہ میں رسول اکرمؐ ایک دوسری حدیث جس میں حضرت علی اور خود کو ایک دوسرے کا جز قرار دیا ہے یعنی برابری بیان کی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس بند کی خاصیت یہ ہے کہ مرزا دبیرؔ نے ممدوح مطلوب کا ذکر کرنے سے پہلے مقدمہ سازی کی ہے۔ پہلے ممدوح کے اجداد و اسلاف کی برتری و عظمت واضح کی ہے۔ نانا اور بابا کی فضیلت بیان کی ہے۔ دونوں کی آپسی محبت، ایک دوسرے کی چاہت کو بیان کیا ہے۔ سورہ رحمٰن میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

"**مرج البحرین یلتقیان، بینھما برزخ لا یبغیان، فبای آلاء ربکما تکذبان، یخرج منھما الؤ لؤوالمرجان** "اسی نے دوسمندروں کو جاری کیا کہ مل جائیں، تاہم ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے، پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے، ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ [3]

۱۔ سیوطی جلد ۱ ص ۳۷۴، ۲۔ مسند ابن حنبل، فصل ۱۴، ص ۸۸ ۳۔ سورہ رحمٰن، آیت ۱۹ تا ۲۲

اکثر مفسرین نے بحرین سے مراد بنت رسول الثقلین فاطمہ زہرا اور حضرت علی مرتضی مراد لیے ہیں اور لؤلؤ و مرجان سے مراد امام حسن اور امام حسین علیھم السلام مراد ہیں۔اتنی باعظمت و صاحب فضیلت شخصیت اگر خاک و خون میں غلطاں ہو جائے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

دُر اور مرجان میں یہ فرق ہے کہ دُر کا رنگ سفید ہوتا ہے اور مرجان کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔''فرہنگ آصفیہ'' میں مرجان کی وضاحت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

> ''مرجان: اسم مذکر، مونگا، حجر البحر، ایک قسم کا سوراخ دار بحری درخت جسے سمندری کیڑے بناتے ہیں یہ اکثر سرخ یا سفید رنگ کا ہوتا ہے اور بحر روم اور ساحل سلی جنوبی اٹلی میں پایا جاتا ہے۔ یہ درخت نبات اور سنگ میں شامل ہے فارسی مین اس کو خردہک کہتے ہیں۔مزاجاً دودرے درجے میں سرد و خشک مانا گیا ہے۔بعض کے نزدیک دوسرے درجہ میں بارد۔عربی میں چھوٹے موتی اور جوہر سرخ کو بھی مرجان لکھا ہے''۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دُر اور مرجان میں اصل فرق رنگ کا ہے ایک سفید موتی ہے تو دوسرا سرخ۔اب تیسرے بند پہ غور کیجئے:

گھی دُر آید و مرجان برون گھه از عمان
بوصف کی دُر و مرجان بود بھم یکسان
دری که غرق بخون باشد آه چون مرجان
ندیده چشم زمان این چُنین دُر الآن
دُرِ یگانهٔ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدهٔ کرب وبلا امام حسینؑ[2]

مرج البحرین سے کبھی موتی نکلتے ہیں تو کبھی مرجان حالانکہ دونوں کی صفت ایک ہے لیکن کبھی بھی دُر سرخ نہیں ہوتا ہمیشہ سفید ہی ہوتا ہے مرزا دبیر نے اپنے اس ترجیع بند کی بیت

۱۔فرہنگ آصفیہ ص ۲۰۷۶ ۲۔مصحف فارسی، ص ۱۷۵

میں امام حسینؑ کو دُر لکھا ہے اور دُر کی رنگت سفید ہوتی ہے۔ اب یہاں مرزا صاحب نے اپنی بات کہی ہے فرماتے ہیں کہ دُر ہمیشہ سفید ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت و فطرت بھی کربلا میں تبدیل ہو گئی دُرِ فاطمہ جب خاک و خون میں غلطاں ہوا تو دُر نے اپنی رنگت بدل دی اور سفید سے سرخ ہو گیا۔ اور اسی مضمون کو چوتھے بند میں وسعت دی ہے۔

بهم شده دُر غلطان اشک و خون جگر
چکیده همه خونناب دل ز دیدهٔ تر
چه رُوییداد که دُر شد برنگ لعل احمر
جز اشکِ خون نبود دُر برنگ لعل دگر
دُرِ یگانهٔ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدهٔ کرب و بلا امام حسینؑ ۱؎

دُر کبھی اپنا رنگ نہیں بدلتا اس کی شہرت کی وجہ ہی اس کا سفید ہونا ہے پھر کیا ہوا کہ یہ سفید موتی سرخ لعل ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق جناب فاطمہ کا عقد حضرت علی کے ساتھ ہوا تو آسمان پر بھی یہ عقد پڑھا گیا جس میں تمام جہان کے پانی کو شہزاری کا مہر قرار دیا گیا۔ حضرت علی کا ایک خاص لقب ساقی کوثر ہے سب آپ کو ساقی کوثر کہہ کر بھی پکارتے ہیں کیونکہ رسول اکرم نے فرمایا:

"قال رسول اللہؐ: یا علی انت اخی و وزیری و صاحب لوائی فی الدنیا والآخرة،و انت صاحب حوضی، من احبک احبنی ومن ابغضک ابغضنی" اے علیؑ تم میرے بھائی میرے وزیر اور میرے علمبردار ہو دنیا و آخرت میں، تم میرے حوض (کوثر) کے ساقی ہو، جس نے تم سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے تم سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ ۲؎

یہ دونوں ذوات مقدسہ امام حسین جیسے موتی کے لئے صدف ہیں۔ موتی کا نقش و

۱۔ مصحف فارسی، ص ۱۷۵ ۲۔ بحارالانوار، ج ۸، ح ۵ ص ۱۸

نگار، اس کی خوبصورتی و زیبائش سب سیپ کی خوبیوں سے متصف ہے جتنا اچھا سیپ ہوگا اتنا ہی اچھا موتی ہوگا۔ یعنی امام حسینؑ کے جملہ کمالات ان کے والدین کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے سماج میں یہ عام خیال ہے کہ اگر کسی کے گھر کو دیکھنا ہو تو اس گھر کے بچوں کو دیکھو ان کا اخلاق و کردار کیسا ہے۔ اگر بچہ کا اخلاق اس کا کردار اچھا ہے تو اس کے والدین قابل تعریف ہوں گے اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہو تو والدین ہی کو کہا جاتا ہے کہ انہوں تہذیب نہیں سکھائی۔ گویا بچے والدین کا پرتَو ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ والدین کی پہچان ہوتی ہے بچے کے کمالات والدین کی مرہون منت ہیں۔ اب اگر حسینؑ جیسا موتی کی مانند ہو تو والدین بھی علیؑ و فاطمہؑ جیسے ہونا ضروری ہیں۔ اسی مفہوم کو مرزا دبیر نے اس بند میں بیان کیا ہے۔

بمهر مادر او جمله آبهای جهان
پدر بساقی کوثر زبان زد دوران
دری ببطن صدف نقش بسته از نیسان
چه در خلاصه محصول قلزم و عمان
دُرِ یگانهٔ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدهٔ کرب و بلا امام حسینؑ [1]

بعد عصر عاشورہ امام حسینؑ نے اپنا سر سجدہ خالق میں جیسے ہی رکھا تو ظالم شمر آپ کے سر کو تن سے جدا کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ اس منظر کو مرزا دبیر نے گوہر سے تشبیہ دے کر بیان کیا ہے کہ گوہر نے اپنے آپ کو خنجر کے نیچے رکھ دیا کیوں کہ جب موتی میں سوئی سے سوراخ کیا جاتا ہے تو وہ گلے میں پہننے کے لائق بنتا ہے یعنی موتی کی زیب و زینت تبھی بڑھتی ہے جب اس میں کانٹ چھانٹ ہوتی ہے۔ امام حسین نے بھی اپنا سر سجدہ خالق میں رکھ کر خنجر قاتل کی پرواہ نہ کر کے اپنی قدر و منزلت میں مزید اضافہ فرمایا ہے۔

---

[1] مصحف فارسی، ص ۱۷۶

بزیر دشنه چو گوهر نهاد با سر خویش
درش بدشنه خنجر نموده جوهر خویش
چو در بسوزن نیزه شگاف زد بر خویش
نمود وا برخ آبرو جو دُر در خویش
دُرِ یگانۂ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدۂ کرب و بلا امام حسینؑ [1]

دُر، لعل، گوہر کی الگ الگ حالتیں ہوتی ہیں۔ کبھی تو وہ صحیح و سالم حالت میں ہوتا ہے، کبھی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا ہے تو کبھی دو حصوں میں برابر منقسم کیا جاتا ہے۔ ایک قسم اور ہے در کی جو نبی پاکؐ کا لقب ہے ''دُرِ یتیم''۔ مرزا دبیر نے یہ تمام حالتیں اہلبیتؑ سے مخصوص کر کے بیان کی ہیں۔ دُر بارش کے قطرات سے بنتا ہے بنت رسول کے آنسو وہی بارش کے قطرات ہیں جن سے در بنتا ہے۔ موتی کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا امام حسنؑ سے متعلق کر دیا کیونکہ زہر ہلاہل کے اثر سے امام حسنؑ کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر طشت میں گرنے لگا۔ موتی کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کو حضرت علیؑ سے مخصوص کر دیا۔ اس لئے کہ ابن ملجم نے جب سر اقدس پر تلوار سے وار کیا تو سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جسے کپڑے سے باندھکر حضرت علیؑ کو بیت الشرف میں لایا گیا تھا۔ امام حسین کو دُرِ یتیم اس لئے کہا کہ کربلا میں نہ والد ہیں نہ والدہ اور نہ ہی بڑے بھائی۔ گویا کوئی سرپرست نہیں اور جس کا سرپرست نہ ہو اسے یتیم ہی کہا جاتا ہے۔

ز اشک مادر او داده سلک دُر تنظیم
بردارش بجگر پاره کرده لعلِ سهیم
صدف نمط پدرش رابه تیغ فرق دو نیم
بکنج خانۂ تقدیر خود ده دُرِ یتیم
دُرِ یگانۂ دریا ی مجمع البحرین
بخون طپیدۂ کرب و بلا امام حسینؑ [2]

۱۔ مصحف فارسی، ص ۱۷۷ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۱۷۷

حضور پاک پہ نبوت تمام ہے آنحضرت آخری نبی ہیں۔ اب جب کوئی دوسرا زمین پر آنے والا نہیں تو خدا نے اپنی مخلوق کی ہدایت و رہنمائی کے لئے امامت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس کا آغاز بھی حضور پاک کی ذات پر برکات سے کیا۔ یعنی حضور پہ نبوت تمام ہے اور آنحضرت ہی کے ذریعہ امامت کی ابتدا ہے۔ حضرت علیؑ کو علم امامت حضورؐ نے سکھایا۔ اسی لئے حضرت علیؑ نے فرمایا: مجھے رسول نے علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے اور میں نے ہر باب سے ۱۰ ہزار علوم وا کیے۔ یعنی حضرت علی کا علم، رسول کریم کا عطیہ ہے۔ امام ابن جریر طبری نے رسول اکرمؐ کی حدیث نقل کی ہے:

''حدثنی محمد بن اسماعیل الضراری ، قال حدثنا: عبد السلام بن صالح الھروی، قال: حدثنا ابو معاویۃ، عن الاعمش، عن مجاھد، عن ابن عباس، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم انا مدینۃ العلم و علی بابھافمن اراد المدینۃفلیاتھا من بابھا " میں شہر علم ہوں علی اس کا دروازہ پس جسے شہر جانا ہے اسے دروازے سے جانا ہوگا''۔[۱]

اور امام حسینؑ انہیں دونوں ذوات مقدسہ کی آغوش کے پروردہ ہیں۔ ایک ہی وقت میں نبوت اور امامت نیناز اٹھائے ہیں۔ نبوت و امامت کی مخلوط تربیت و پرداخت کا نام حسینؑ ہے۔ بحر نبوت و بحر امامت کے جمع ہونے کے بعد جو علم کی نہر یا دریا جاری ہوئے انہیں حسینؑ کہا جاتا ہے۔

امامت است و نبوت دو بحر پُر زگھر
کہ بود مجمع آن ھر دو بحر پیغمبرؐ
چوھر دو بحر دران جمع شد بیک دیگر
کہ بود حاصلِ جمع دو بحر را مظھر
دُرِ یگانۂ دریای مجمع النحرین
بخون طپیدۂ کرب و بلا امام حسینؑ[۲]

۱۔ تہذیب الآثار مسند علی طبری، ۱۰۵/۳ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۱۸۰

رسول اکرم نے اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے جو احادیث ارشاد فرمائی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف حدیث ہے:

"**قال رسول اللہؐ:فاطمة بضعة منی من آذاها فقد آذانی**"رسول اکرمؐ نے فرمایا: فاطمہ میری پارہ جگر ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔[1]

صحیح مسلم میں یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

"**قال رسول اللہؐ: انما فاطمة بضعة منی آذانی من آذاها**'رسول نے فرمایا: فاطمہ میری پارہ جگر ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔[2]

سنن ترمذی میں قدرے مختلف الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

"**قال رسول اللہؐ:انما فاطمة بضعة منی آذانی من آذاها و ینصبنی من انصبها**"رسول نے فرمایا: فاطمہ میری پارہ جگر ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔جس نے تیری رضا حاصل کی گویا اس نے مجھے راضی کیا۔[3]

رسول اکرم نے حضرت علی کو روز مباہلہ اپنا نفس قرار دیا:

"**فمن حاجّک فیه من بعد ما جائک من العلم فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم و نسائنا و نسائکم و انفسنا و انفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله علی الکاذبین**'' آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (عیسیٰ کے بارے میں) جھگڑا کریں تو آپ کہدیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم

۱۔صحیح بخاری جز۱۲ص۴۸۴، بحارالانوار، ج۳ص۱۱۶ ۲۔صحیح مسلم ج۱۲ص۲۰۳ ۳۔سنن ترمذی، ج۵،ص۴۹۵

اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا
ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔[1]

تفسیر بیضاوی میں اس آیت کے ذیل میں تفصیلی واقعہ مندرج ہے جس کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے۔

''نصاریٰ نجران حضور اکرم کے لاکھ سمجھانے کے بعد بھی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہہ رہے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی جس کی اعتبار سے رسول اور نصاریٰ نجران میں یہ طے ہوا کہ وقت مقررہ و جائے معینہ پر اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے نفسوں کے ساتھ جمع ہو کر دعا کریں کہ خداوند عالم جھوٹوں پر لعنت فرمائے۔ لہٰذا رسول اکرمؐ بحکم خدا عورتوں میں جناب فاطمہ نفوس میں حضرت علی اور بیٹوں میں حضرات حسنینؑ کو لے کر میدان میں پہنچے تو نصاریٰ کا سردار ''عافث'' کہنے لگا خدا کی قسم میں ایسے روحانی چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹنے کا حکم دیں گے تو وہ اپنی جگہ چھوڑ دے گا اسی میں خیریت ہے کہ مباہلہ سے باز آؤ ورنہ تا قیامت ایک بھی عیسائی نہ بچے گا''۔[2]

اسی واقعہ کو چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شاہ فہد بن عبد العزیز آل سعود کی جانب سے حجاج کرام کو بطور تحفہ پیش کیے جانے والے قرآن کریم مع اردو ترجمہ کے صفحہ ۱۵۰ پر مذکور ہے۔ مرزا دبیر نے حضرت علیؑ و فاطمہؑ کی عظمت و فضیلت، قرآن و احادیث کی روشنی میں بیان کرنے کے بعد امام حسینؑ کی جانب اشارہ کیا ہے کہ جب یہ دونوں با فضیلت شخصیات یکجا ہوئیں تب حسینؑ جیسا دُرِ بے بہا عالم وجود میں آیا۔

رسولؐ را بحدیثِ صحیح بضعه بتولؑ
بنصّ انفسنا هم علیؑ ست عینِ رسولؐ
بهم چو ربط نمودندعین و بضعه قبول
ز ربط چیست مران عین و بضه را محصول

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۶۱ ۲۔ تفسیر بیضاوی جلد اول ص ۱۱۸

دُرِ یگانۂ دریای مجمع البحرین

بخون طپیدۂ کرب و بلا امام حسینؑ ۱؎

اسلام میں قتل کی سخت مذمت کی گئی ہے قرآن کریم میں اس حوالے سے مختلف آیات نازل ہوئی ہیں:

"**کتبنا علی بنی اسرائیل انه من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاها فکانما احیا الناس جمیعا**" ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم مقرر کیا کہ جس نے کسی ایک کو قتل کیا جب کہ یہ قتل خون کے بدلے میں یا زمین میں فساد پھیلانے کے بدلے میں نہ ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے کسی ایک کی جان بچائی تو گویا س نے تمام انسانوں کی جان بچائی ۔۲؎

"**ومن یقتل مومنا متعمدا فجزائه جهنم خالدا فیهاو غضب الله علیه و لعنه و اعد له عذابا عظیما**" جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کے مار ڈالے اس کی سزا دوزخ ہے اور ہمیشہ اس میں رہے گا اس پر خدا نے اپنا غضب ڈھایا ہے اور اس پر لعنت کی ہے۔ ۳؎

"**یا ایها الذین اٰمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثی**" اے مومنو جو لوگ ناحق مار ڈالے جائیں ان کے بدلے میں تم کو جان کے بدلے جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے اور آزاد کے بدلے آزاد اور عورت کے بدلے عورت ۔۴؎

۱۔مصحف فارسی، ص ۱۸۱ ۲۔ مائدہ آیت ۳۲ ۳۔نساء آیت ۹۳ ۴۔ بقرہ آیت ۱۷۸

ان تمام آیات کی روشنی میں یہ امر واضح ہو گیا کہ جان کی کوئی قیمت نہیں۔ قرآن نے تو عام انسان کی جان کی قیمت کی بات کی ہے لیکن مرزا دبیرؔ امام حسینؑ علیہ السلام کی بات کر رہے ہیں۔ جب ایک عام انسان کی جان انمول ہے تو پھر نواسہ رسول کا خون بہا کیا ہوسکتا ہے۔مرزا دبیرؔ نے اسی مضمون کو ان دو بندوں میں مسلسل نظم کیا ہے پہلے بند میں سوال ہے کہ ایسی ذات کا خون بہا کیا ہوسکتا ہے؟ اور دوسرے بند میں جواب دیا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی جان کی قیمت امت عاصی کی بخشش قرار دی ہے۔ اپنا خون بہا نانا کی امت کے لئے معاف فرما دیا ہے۔

محقق است خود این نکته عقلِ جانین را
دری است جان بها نیست جانِ شیرین را
چو بی بهاست نبا شد بها دُرِ این را
بها بعفوِ امم کرد جانِ بی کین را
دُرِ یگانۂ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدۂ کرب وبلا امام حسینؑ

فدای نفس که در دفع بارِ امّت کرد
بنفس ترک خود و اختیارِ امّت کرد
برای عفو گنه جان نثارِ امّت کرد
بهای خویش همه صف کارِ امّت کرد
دُرِ یگانۂ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدۂ کرب و بلا امام حسینؑ [1]

مرزا دبیرؔ مکالمہ نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں مثلاً شہادت امام حسینؑ کے بعد کے منظر میں وہ بیان کرتے ہیں کہ آسمان نے زمین سے پوچھا کیا ہوگیا ؟ کیوں یہ قیامت ٹوٹی پڑ رہی ہے ہر طرف اداسی ، بے چینی ، اضطراب ، رنجیدگی ، کبیدگی ،

۱۔ مصحف فارسی، ص ۱۸۳

پریشاں حالی کیوں ہے؟ سید سجادؑ یتیموں کی مانند چاک گریباں کیوں ہیں؟ آج ابن الحسین کا گریبان صدف کی مانند چاک ہوا کیوں ہے؟ مرسل اعظمؐ کی فریاد و بکا کی وجہ کیا ہے؟ کیوں خاتم المرسلینؐ ماتم کناں ہیں؟ یہ کس کے حال میں پریشاں حال ہیں؟ یہ اہلبیت پیغمبرؐ کا ایسا حال کس نے کیا ہے؟ تو زمین نے جواب دیا رسول کا پیارا نواسہ، فاطمہ کا جگر پارہ، علی مرتضی کا دلارا، دین اسلام کا سہارا بے گور و کفن میرے اوپر پڑا ہوا ہے یہ انمول موتی جو مجمع البحرین سے حاصل ہوا ہے اسے کربلا میں خاک و خون میں تر بتر کر دیا گیا ہے۔

خطاب کرد فلک ای زمیں چه روداد است
چه شد که مثلِ صدف سینه چاک سجادؑ است
چه اُفته است که روحِ نبیؐ بفریاد است
زمین گفت که بی گور برمن افتاد است
دُرِ یگانۂ دریای مجمع البحرین
بخون طپیدۂ کرب و بلا امام حسینؑ ا؎

مرزا دبیر نے مقطع کے بند میں صنعت متتابع کا استعمال کیا ہے صاحب بحر الفصاحت نے اس صنعت کی تعریف اس طرح رقم کی ہے:

> ''صنعت متتابع: لغت میں متتابع پے در پے کے معنی میں ہے۔
> اصطلاح میں اسے کہتے ہیں کہ بات میں سے بات نکالیں اور الفاظ
> اس طرح آویں کہ ایک کی متابعت کی وجہ سے دوسرا آوے'' ۲؎

مصرع اولی میں ''صفحہ'' استعمال کیا دوسرے مصرع کی ابتدا بھی ''صفحہ'' سے کی۔ دوسرے مصرع میں ''غم'' کا استعمال کیا تو تیسرے مصرع کی ابتدا میں اسی لفظ ''غم'' کو رکھا۔ تیسرے مصرع میں ''در'' کا استعمال کیا تو چوتھے مصرع میں بھی ''در'' ہے اور پھر بیت کا مصرع اول بھی ''در'' سے شروع کیا ہے۔ مرزا دبیر نے اپنے اشکوں کو موتی سے تعبیر کیا ہے۔

ا۔ مصحف فارسی، ص ۱۸۶ ۲۔ بحر الفصاحت، ح۲، ص ۱۲۴۲

ز اشک ریخت گهر چون قلم بصفحه دبیرؔ
بصفحه کرد چه دُرها ز اشکِ غم تصویر
غمِ شکسته دُری کرد برورق تحریر
بنا بوصف چه دُری نهاد در تقریر
دُرِ یگانۀ دریا ی مجمع البحرین
بخون طپیدۀ کرب و بلا امام حسینؑ[1]

الغرض مرزا دبیرؔ نے اس ترجیع بند اپنی پوری فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے اور لفظ ''در'' کی رعایت ہر بند میں شروع سے آخر تک برقرار رکھی ہے۔ جس کے مطالعہ سے مرزا صاحب کی شاعرانہ مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ مصحف فارسی، ص ۱۹۷

مرثیه (ترجیع بند)۔۲

مذکورہ مرثیہ بھی ترجیع بند کی شکل میں موزوں کیا ہے۔آسمان کو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہوتی اور نہ ہی آسمان کسی کا برا کرتا ہے۔وہ تو اپنی جگہ معلق ہے مرزا دبیرؔ نے آسمان کو بطور استعارہ نظم کیا ہے۔جس کے ذریعہ مصائب آل محمد بیان کیے ہیں۔

فلک ز آل پیمبرؐ ترا چه کین اُفتاد
که جور دور تو بی مهر در کمین افتاد
بخاک شمشه ایوانِ شرع و دین افتاد
ز مُهرِ خاتمِ پیغمبرانؐ نگین افتاد
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد [۱]

مرزا دبیرؔ نے مذکورہ بند میں آسمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں اے آسمان تجھے آل پیمبرؐ سے کیا بیر ہے کہ تیری گردش نے کیا کیا نہ ظلم ڈھائے اور جور وستم کے تیر برسائے۔ امام حسینؑ دین سمجھنے سمجھانے کا کردار(پیمانہ) ہیں لیکن یہی پیمانہ خاک وخوں میں غلطاں ہوگیا گویا کہ مہر نبوت کا نگینہ ہی گر گیا۔ان مصرعوں میں مرزا دبیرؔ نے ایک جگہ شمشہ اور دوسری جگہ نگینہ امام حسینؑ کے لئے استعارہ بنایا ہے۔ مذکورہ بند کی اساسی بیت میں تضاد کے ذریعہ زور پیدا کیا ہے آسمان و زمین متضاد ہیں۔مرزا دبیرؔ دیکھتے ہیں باعظمت شاہ گھوڑے کی زین سے گر گیا۔اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو آسمان زمین پر گر گیا۔

منظر نگاری میں مرزا دبیرؔ کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ایک مرثیہ نگار کے لئے

۱۔مصحف فارسی، ص ۱۹۸

ضروری ہے کہ وہ ایک بہترین منظرنگار بھی ہوتا کہ واقعات کو اس طرح بیان کرے کہ سننے والے کی نظروں کے سامنے واقعہ کا منظر اس طرح آ جائے جیسے وہ کہ جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کلام کی خوبصورتی کے لئے مترادفات کا استعمال کرنا سبک ہندی کی خاصیت تھی۔ سبک ہندی کی خصوصیت مرثیہ میں صاف نظر آتی ہے۔ ایک واقعہ کو اتنا طول دے کر بیان کرنا، صنعتوں سے سجانا سنوارنا، ایک حالت کو بیان کرنے کے لئے مصاریع کا استعمال، جو مضمون ایک رباعی میں بیان کیا جاتا ہے اسی مضمون کو مرثیہ بشکل مسدس ۱۵۰ یا ۲۰۰ بندوں میں نظم کرنا یہ سب شاعرانہ فنکاری ہے۔ فارسی کے دیگر سبک کے مقابل سبک ہندی اسی لئے مشکل مانا جاتا ہے کہ اس میں مسجع، مقفی و مرصع الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ مضمون کو پیچیدہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ خوبی مرزا دبیر کے کلام کا طرہ امتیاز ہے۔

بسینه داغ و بدل کثرتِ هموم و غموم
جگرفگار وبدن چاک و خشکی حلقوم
هزار ظالم بی رحم و آه یک مظلوم
بخیمه گاه چنین شورِ زینبؑ و کلثومؑ
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد [۱]

مذکورہ بند میں پریشانی، بےچینی اور اضطرابی حالت کو بیان کرنے کے لئے مرزا صاحب نے کس طرح ان الفاظ کو موتیوں کی طرح پرویا ہے۔ ایک حیران و پریشان شخصیت کے احوال بیان کرنا اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنا مرزا دبیر کا ہی کارنامہ ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بند میں مرزا دبیر نے شہادت امام حسینؑ کا منظر بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور منظرکشی اس طرح کی ہے سب کچھ نظروں کے سامنے محسوس ہوتا اور ایسی حالت میں پتھر دل انسان کی بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ چڑھا ہے سینے پہ قاتل ہے حلق پر خنجر، جگر میں

۱۔ مصحف فارسی، ص ۲۰۰

نوک ہے ناوک کی تو دل میں ہے خنجر، ہیں بھوکے پیاسے کئی روز کے شہ صفدر، ہیں اشک ریز سبھی شاہ دیں کی حالت پر، اور اس کے بعد وہی بیت پلٹتی ہے۔

شاعر کلام میں صنعتوں کا استعمال کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔صنعتوں میں عام طور پر تشبیہ، تمثیل، تلمیح کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے تنسیق الصفات، مراعات لنظیر جیسی صنعتوں کم استعمال ہوتی ہیں کیوں کہ ان صنعتوں کا استعمال کرنا عام شاعر کے بس کا نہیں ہے اس کے لیے شاعر کو زبان پر مکمل دسترس کے ساتھ فصاحت و بلاغت سے آشنائی بھی لازمی ہے۔

بسنیه قاتل وبر حلق خنجرِ فولاد
سنان بدل بجگر نوکِ ناوک بیداد
گرسنه تشنه جفا دیده بی وطن ناشاد
فغانِ حور و مَلک وا محمداً فریاد
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد [1]

مذکورہ بند کے ابتدائی تین مصرعوں میں صنعت تنسیق الصفات پائی جاتی ہے۔ بسینہ قاتل، برحلق خنجر، سنان بدل، بجگر نوک ناوک، گرسنہ، تشنہ، جفا دیدہ اور بے وطن تنسیق الصفات ہے۔ شمس قیس رازی نے تنسیق الصفات کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''تنسیق الصفات آنست کی شاعر چند وصف مختلف بر بی یکدیگر دارد و یک چیز را چند صفت مختلف کند''. [2]

نجم الغنی رامپوری ''بحر الفصاحت'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''صنعت تنسیق الصفات یعنی کسی چیز یا کسی شخص کا ذکر صفات متواترہ کے ساتھ کریں خواہ وہ صفات مدح کی ہوں یا مذمت کی

۱۔ مصحف فارسی، ص ۲۰۱ ۲۔ المعجم، ص ۳۸۶

کیوں کہ صفت وہ چیز ہے جو کسی چیز کے ان معنی کو بیان کرے جو
اس میں ہوں خواہ وہ معنی اچھے ہوں یا برے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ
صفت سے فقط خوبی ہی مراد ہوتی ہے بلکہ برائی ہو تو بھی صفت
کہلائے گی''۔[1]

حسینؑ غریب پر کیا کیا ظلم و ستم ٹوٹے۔ امام حسینؑ سے جتنی محبت رسول اللہؐ کو تھی۔ اتنی ہی امام حسینؑ کو اپنے نانان سے بھی تھی۔ اسی لئے نانا اور نواسے کی محبت بیان کرنے والے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ جب سید الشہداء سفر کربلا پر نکلے تو نانا کے مزار پر رخصت کے لئے گئے اور فریاد کی نانا یہ ستمگار مجھے آپ کے پاس رہنے نہیں دے رہے اسی طرح ماں کی قبر پر جا کر فریاد و استغاثہ کیا تھا۔ کہ اماں اب تمہارا حسینؑ قبر کی شمع روشن کرنے نہیں آ پائے گا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کو مدینہ چھوڑنا کتنا قلق تھا۔ امام حسین کو کوفے والوں نے مہمان بلا کر بے یار و مددگار چھوڑا اور پھر یزید کی فوج میں شامل ہو کر نواسہ رسول کو شہید کر دیا۔

فلک چه ظلم نه بر آلِ مصطفاؐ کردی
حسینؑ را ز مزارِ نبیؐ جدا کردی
بدشت بردی و در رنج مبتلا کردی
بنای حادثهٔ نو دگر بپا کردی
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش برزمین افتاد [2]

پروردگار عالم نے حضور اکرمؐ کو ختم نبوت سے سرفراز کیا سبھی انبیاء کا سید و سردار بنایا۔ قرآن کریم میں رسول اکرم کی شان میں آیت نازل فرمائی:

''**و هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً**'' خدا وہ ذات ہے جس نے روی زمین پر موجود ہر چیز کو تمہاری خاطر خلق کیا۔[3]

۱۔ بحر الفصاحت، ج۲، ص۱۳۱۴ ۲۔ مصحف فارسی، ص۲۰۲ ۳۔ سورہ بقرہ آیت ۲۹

حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا:

”**لولاک لما خلقت الافلاک**“ اے رسول اگر تم نہ ہوتے تو آسمانوں کی تخلیق نہ ہوتی۔[1]

خدا نے آپ کے خاتم النبیین ہونے کا اعلان فرمایا ہے:

”**وما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله و خاتم النبیین**“ محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم المرسلین ہیں۔[2]

یا ایک مقام پر قرآن نے نبی کریم کی شخصی حیثیت سے نفی کر کے رسالت کی گواہی دی:

”**وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم**“ اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟[3]

مولانا رومی نے اپنی مثنوی کے دفتر پنجم میں اسی مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

با محمد بود عشق پاک جفت
بهر عشق اوراخدا لولاک گفت [4]

نظامی نے اپنے خمسے میں نعت نبی میں ”خرد نامہ“ کے زیر عنوان کہا ہے:

غلط گفتم آن شاه سدره سریر
که هم تاجور بود و هم تخت گیر
تنش محرم تخت افلاک بود
سرش صاحب تاج لولاک بود [5]

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب ص ۲۱۷، بحار الانوار ج ۱۶ ص ۴۰۵، ایضاً ج ۱۷ ص ۱۱۵ ۲۔ احزاب آیت ۴۰
۳۔ آل عمران آیت ۱۴۴ ۴۔ مثنوی معنوی مولوی ۵۔ اقبالنامہ/ اسکندرنامہ/ خمسہ نظامی، ص ۱۰۲۱

کلام پاک میں خدا نے جس نبی کی اتنی تعریف و توصیف بیان کی ہے جس کے صدقے میں کل کائنات خلق کی ہے جو سب نبیوں کا سردار ہے جس کے سبب یہ دنیا گلزار ہے جس نے اپنے پیارے نواسے کو اپنے جیسا، اپنی آنکھوں کا نور، دل کا سرور، اپنے گلشن کا پھول بتا کر جگہ جگہ اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور اس کی محبت کو واجب قرار دیا تھا اسی نواسے پر نام نہاد کلمہ گویوں کی یلغار ہے۔ آج تک تاریخ اس واقعے سے شرمسار ہے۔ دنیا میں بہت کم ایسے کم ظرف ملیں گے جو اپنے ہادی و رہبر کے اہل خانہ کو تہہ تیغ کریں۔ اسی مفہوم کو مرزا دبیر نے نظم کیا ہے۔ کہ جس نبی کے لئے لولاک کا ترانہ گایا گیا، تاج ختم نبوت جس کے سر پر سجایا، اس نبی نے خطبہ روک کر جس کو اٹھایا، عید کے دن کاندھے پہ چڑھایا۔ اس پیارے نواسے کو ظالموں نے خون رلایا۔ دوش نبی کے سوار کو خاک میں ملا دیا۔

شہیٔ که بود بمصداقِ معنئ لولاک
نهاده تختِ نبوّت تبارکِ افلاک
ز انقلابِ زمان بین که در خس و خاشاک
ز پشتِ اسپ فتاده نبیره اش برخاک
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش برزمین افتاد [1]

نبی کریمؐ کو خدا نے رحمۃ للعالمین بنایا ہے۔ ساری کائنات کو انہیں کی محبت میں خلق کیا۔ اس لئے سورج اور چاند حضور کے اشاروں پہ چلے ہیں۔ نظام کائنات نبیؐ کے زیر تصرف ہے اللہ نے اپنے پیارے محبوب کو یہ تمام قوت و طاقت دی ہے کہ کائنات نبی کے اشارے پر چلتی ہے۔ اور تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی ملتا ہے جب نبوت اپنے دوش کے سواروں کے مطابق راستہ طے کر رہی تھی یعنی رسول کے کاندھے پر بیٹھے ہوئے ان کے نواسے جن کے ہاتھوں میں نبی کریم نے اپنی زلفیں دیدی تھیں تو ان کے

۱۔ مصحف فارسی، ص ۲۰۳

ہاتھوں میں وہ زلف رسول نہیں تھی بلکہ کائنات کی لگام تھی۔اس واقعہ کو مختلف علماء نے نقل کیا ہے۔

اگر کسی میں تقابلی مفاہیم نظم کیے جائیں تو اس سے کلام میں جاذبیت بڑھ جاتی ہے اور اذہان خود بخود متوجہ ہو جاتے ہیں۔مثلاً اگر ہمیں اپنے محبوب کی تعریف کرنی ہے تو اگر پہلے دشمن کی خامیاں بیان کرنے کے بعد جب اس کی خوبیاں بیان کی جائیں گی تو اس کی خوبیاں زیادہ نمایاں نظر آئیں گی۔جس طرح سفید رنگ چمکدار ہوتا ہے لیکن اگر اس کے گرد سیاہ رنگ کر دیا جائے تو سفید میں اور زیادہ تابندگی پیدا ہو جاتی ہے اس کی درخشندگی دوچند ہو جاتی ہے۔ٹھیک اسی طرح جب ظالم کے ستم جس قدر بھی بیان کئے جاتے ہیں مظلوم سے ہمدردی اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔مرزا دبیر نے واقعے کے اثرات کو نظم کیا ہے کہ رسول کریم اور ان کی آل پاک کا کیا عالم ہے اور یزید اور اس کے حواریوں کی کیا کیفیت ہے۔امام حسینؑ کی شہادت کے بعد یزید خوش ہے مسرور ہے اور رحمۃ للعالمین کا دل نواسے کے غم میں دو پارہ ہے۔شہر کوفہ جو اس وقت یزیر کے زیر نگیں تھا وہاں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے اور اہل حرم غم و الم سے دوچار تھے۔بنی امیہ شہادت امام حسین پر شاد و مسرور تھے اور بنی ہاشم اپنے حسینؑ کی شہادت سے پیکر غم و الم۔

یزید خرّم وخندان دلِ رسولؐ دونیم
بکوفه جشن و به اهلِ حرم ملال عظیم
فغان ز گردشِ دوران و آسمان لئیم
چرا شود نه بسال سوم سکینهؑ یتیم
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد [1]

صنعت تکرار سے اکثر شعرا کلام میں جان پیدا کرتے ہیں کسی بات میں شدت پیدا کرنے کے لیے یا غم والم کی کیفیت بیان کرنے کے لیے لفظ کی تکرار کی جاتی ہے۔خصوصاً آہ و

ا۔مصحف فارسی، ص ۲۰۵

بکا میں لفظ کی تکرار کی جاتی ہے۔ جیسے ہائے ہائے وغیرہ۔ مذکورہ بند میں مرزا دبیر نے حسینؑ کی تکرار کی ہے۔

هزار حیف سر از تن جدا حسینؑ حسینؑ
بماتمِ رفقا مبتلا حسینؑ حسینؑ
بزیر تیغ زند دست و پا حسینؑ حسینؑ
بنوحه فضّه صدا زد که وا حسینؑ حسینؑ
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگرغلط نکنم عرش بر زمین افتاد[۱]

امام حسینؑ اپنے والدین کے علاوہ اپنے نانا رسول خداؐ کے بھی نور عین تھے۔ آنحضرت کو اپنے نواسے سے بے انتہا الفت و محبت تھی۔ جس کی دلیل آنحضور کی وہ احادیث ہیں جو آپ نے امام حسین کی محبت میں بیان فرمائی۔ رسول خدا نے ارشاد فرمایا:

"حسین منی و انا من حسین احب الله من احبا حسینا حسین سبط من الاسباط" حسین مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں خدا اس سے محبت کرتا ہے جو حسین کو محبوب رکھتا ہے حسینؑ میری اولاد میں سے ہے۔[۲]

"قال رسول الله: ان الحسن والحسین هما ریحانتای من الدنیا" رسول اکرم نے ارشاد فرمایا: بے شک حسن حسین دنیا میں میرے لئے جنت ہیں۔[۳]

"قال رسول الله: الحسن والحسین ابنای، من احبهما احبنی،و من احبنی احبه الله ومن احبه الله ادخله الجنة ومن ابغضهما ابغضنی ومن ابغضنی ابغضه الله و ابغضه الله ادخله النار" رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: حسن اور حسین

۱۔ مصحف فارسی، ص ۲۰۶ ۲۔ سنن ترمذی، ج ۵، ص ۶۵۸ ۳۔ صحیح بخاری، ج ۵ ص ۳۳

میرے بیٹے ہیں، جس نے ان دونوں سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے مجھ سے محبت کی وہ خدا کا محبوب ہوگیا، جو خدا کا محبوب ہوگیا وہ جنت میں داخل ہوگا، جس نے ان دونوں کو ناراض کیا اس نے مجھے غضبناک کیا، جس نے مجھے غضبناک کیا اس نے خدا کو غضبناک کیا اور جس خدا جس پر غضبناک ہوا اسے جہنم بھیج دے گا۔[1]

مندرجہ احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول کریم کو اپنے پیارے نواسے سے کس قدر پیار تھا۔ ایک ماں جتنی محبت اپنی اولاد سے کرتی ہے اتنا کسی سے نہیں ماں کی مامتا کے آگے ہر طرح کی محبت کم ہے۔ اس کے بعد میں ماں باپ کی محبت آتی ہے یعنی اتنی محبت باپ بھی کرتا جتنی ماں کرتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ماں مرنے کے بعد بھی اپنی اولاد کے لئے بے چین رہتی ہے۔ ماں کی محبت کے حوالے سے رضا سرسوی نے مامتا کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحہ قرطاس پر اتارنے کی کوشش کی ہے:

ابوترابؑ عزا دارِ او بخاک نشست
بخلد فاطمہؑ زان درد سینہ چاک نشست
نشست سرورؑ کونین دردناک نشست
چہ جبرئیل بماتم چو حیّ پاک نسشت
بلند مرتبہ شاھی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد[2]

جب شاعر کلام میں کسی ایک مصرع میں ایک سے زیادہ عدد بیان کرے تو وہ صنعت سیاقۃ الاعداد کہلاتی ہے۔ المعجم میں شمس قیس رازی ان الفاظ میں سیاقۃ الاعداد کی تعریف بیان کی ہے:

"سیاقة الاعداد: خواندن آن چنان باشد کی شاعر چند

۱۔ مستدرک حاکم، ج ۳ ص ۱۶۶ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۲۰۷

چیز از اسماء مفرده بر شمارد و آنکه جمله را یک یک وصف کند''. [۱]

مرزا دبیر نے مذکورہ بند میں امام حسینؑ کے بدن پر موجود زخموں کی تعداد ۱۹۵۱ بیان کی ہے۔ اس میں ''**نهصدو پنجاه و یک**'' ''**صنعت سیاقة الاعداد**'' ہے۔ اکثر شعرا اپنے محبوب کی تعریف، اس کے فضائل یا مصائب بیان کرنے کے لیے مبالغہ سے کام لیتے ہیں اس مصرع میں بھی زخموں کی یہ تعداد مبالغہ ہے کیوں کہ امام حسین کے جسم میں کتنے زخم تھے اس کی معلومات سہی طور پر کسی کو نہیں ہے۔ مقاتل کی کتابوں میں بھی مختلف روایات ہیں لہذا کسی ایک عدد کو حتمی نہیں مان سکتی۔ مذکورہ بند اور مقطع کا بند ایک دوسرے سے مسلسل ہیں۔ اس بند کے تیسرے مصرع میں تقابل ہے کہ کہاں نور الہی اور زمین کربلائی۔ کہ جس کے غم میں قدرت کے قلم نے لوح محفوظ پر اس غم کو تحریر کر دیا۔

بجسمِ نازک فرزندِ شیر ربّ ودود
هزارو نهصدو پنجاه و یک جراحت بود
کجا زمین و کجا نورِ خالق معبود
بنوحه خامۂ قدرت ز لوحِ عرض نمود
بلند مرتبه شاهی ز صدرِ ززین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد [۲]

پہلے بند کا ہی مضمون اس بند میں مسلسل ہے کہ قدرت کے قلم نے لوح محفوظ پر جو لکھا وہ عناصر اربعہ ہفت آسمان کے تحت ظہور پذیر ہوا۔ عناصر اربعہ یعنی آگ، پانی، مٹی، ہوا۔ یہی وہ عناصر ہیں جن سے جسم انسانی ترکیب پاتا ہے۔ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا [۳]

۱۔ المعجم ص ۳۸۷ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۲۰۸ ۳۔ صبح وطن، ص ۱۸۶

یا میر تقی میر نے کہا ہے:

کیسی کیسی ہے عناصر میں بھی صورت بازی
شعبدے لاکھوں طرح کے ہیں انہیں چاروں میں [1]

آدمی سیتھلی نے اس مضمون کو آسان و سہل زبان میں بیان کر کے نکھار دیا ہے:

تعارف: آدمی ہوں! اور مذہب؟ عشق ہے میرا
وطن؟ آتش ہوا افلاک و آب و گل میں رہتا ہوں [2]

مرزا دبیر نے عناصر اربعہ کے ساتھ ساتھ ہفت چرخ وغیرہ کو بھی نظم کیا ہے:

بلوح انچه که زد نقش خامۂ تقدیر
ز چار رکن و موالید و هفت چرخ اثیر
رقم ز هرکه شده بهرِ حضرت شبیرؑ
ز زین فتاده چو آن شہؑ نوشت کلکِ دبیر

بلند مرتبه شاهی ز صدرِ زین افتاد
اگر غلط نکنم عرش بر زمین افتاد [3]

انسانی جسم انہیں چار عناصر سے ترتیب پاتا ہے۔ دست قدرت نے قربانی اسماعیلؑ کو جب ذبح عظیم کے لیے ٹال دیا اور قرآن نے اپنا فیصلہ سنایا:

"**و فدیناه بذبحٍ عظیمٍ** . اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا" [4]

اس مضمون کو علامہ اقبال نے اس اس طرح شعری جامہ میں ڈھالا ہے:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ [5]

۱۔کلیات میر تقی میر، دیوان دوم، ص۵۰۳ ۲۔مخطوطہ آدمی سیتھلی نمبر۱۲،ص۱۶ ۳۔مصحف فارسی، ص۲۰۹
۴۔صافات آیت ۱۰۷ ۵۔بال جبریل، کلیات اقبال، ص۳۵۵

اور یہ واقعہ کربلا میں وقوع پذیر ہوا جسے دبیرؔ کے قلم کی نوک نے بیان کیا ہے۔ اس بند میں صنعت توسیم کا بھی مرزا دبیرؔ نے خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ شمس قیس رازی نے صنعت توسیم کی تعریف اس طرح کی ہے:

"صنعت توسیم: آنست که بنای قافیت بر حرفی نهد که نام ممدوح یا آنچه مقصود شاعر ست در آن تنسیق گردد". [1]

نجم الغنی رامپوری نے بھی صنعت توسیم کی تعریف بیان کی ہے:

''صنعت توسیم لغت میں اس کے معنی ہیں نشان کرنا۔ اصطلاح علم بدیع میں اس سے مراد یہ ہے کہ شاعر بنیاد قافیے کی ایسے حروف پر رکھے کہ ممدوح کا نام اس میں آجائے''۔ [2]

اور مرزا دبیرؔ کے ممدوح کا نام شبیر ہے اسی لئے مرزا صاحب نے تقدیر، اثیر کے ساتھ اپنا تخلص دبیرؔ استعمال کیا ہے۔ جس میں قافیہ کے طور پر شبیر کو مرکزیت ہے۔

☆☆☆☆☆

۱۔ المعجم، ص ۲۳۷۳ ۔ بحر الفصاحت، ح ۲، ص ۱۲۴۰

ترجیع بند

مذکورہ ترجیع بند میں مرزا دبیر نے روضۂ امام حسینؑ کی عظمت و فضیلت بیان کی ہے۔ یہ پورا ترجیع بند فضائل رسولؐ و آل رسولؐ سے مملو ہے۔ امام عالی مقام کا روضہ مبارک عراق کے شہر کربلا میں واقع ہے۔ آج جو موجودہ روضہ ہے اس ہیئت وشکل میں آنے میں اسے طویل عرصہ لگا۔ اس ترجیع بند کی خاص بات یہ ہے کہ مرزا دبیر نے اس مسدس میں دو بیت موزوں کیے ہیں حالانکہ دونوں بیتوں کا مصرع ثانی ایک ہے لیکن مصرع اولی میں بہت فرق ہے۔ پہلی بیت کا مصرع اولی ''فعل نہی'' میں ہے اور دوسری بیت کا مصرع اولی ''فعل امر'' میں ہے۔ پہلی بیت میں فرماتے ہیں بے ادبی سے قدم نہ رکھو اور دوسری بیت میں فرماتے ہیں ادب کے ساتھ قدم رکھو۔ اس مسدس میں ۲۰ر بند ہیں جن میں سے پہلی ۱۰ر بیت یعنی فعل نہی میں اور بقیہ ۱۰ بیت امر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس ترجیع بند پر گفتگو سے پہلے تھوڑی روشنی روضے کی تعمیر پر ڈالی جارہی ہے۔ روضہ مبارک کی تعمیر اس کے منزل بہ منزل احوال کچھ اس طرح ہے:

۱۳ محرم الحرام ۶۱ھ واقعہ کربلا کے تین دن بعد تیرہ محرم ۶۱ ہجری کو امام سجاد علیہ السلام کے حکم اور دفن کی جگہوں کے ترتیب وتعیین کے مطابق قبیلہ بنی اسد نے شہداء کربلا کی تدفین کا کام سرانجام دیا۔ قبیلہ بنی اسد کربلا کے اطراف میں ایک گاؤں میں آباد تھا۔ پہلی مرتبہ قبیلہ بنی اسد ہی نے ان قبروں پر تعمیر کا کام کیا۔ اس قبیلہ کے لوگوں نے کھجور کے چار تنے امام حسین علیہ السلام کی قبر کے چاروں طرف گاڑ کر ان پر کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چھت ڈال دی۔

> ''اموی بادشاہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ حکومت میں کوفہ سے
> تعلق رکھنے والے توابین کا ایک گروہ ۶۵ ہجری کو سلیمان الخزاعی

کی قیادت میں کربلا آیا اور امام حسین علیہ السلام کی قبرِ اقدس کے گرد اس طرح جمع ہو گیا جس طرح حاجی حجرِ اسود کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ یہ گروہ چار ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ توابین کا یہ گروہ امام حسین علیہ السلام کے خون کا بدلہ لینے کے لیے نکلا تھا اور کربلا میں اپنے مختصر قیام کے دوران اس گروہ نے تعمیر کا کام بھی کیا''۔ ۱؎

''مرقدِ حسینی کا مختصر تاریخچہ''

۶۱ھ میں شہادت امام حسینؑ کے بعد عباس علمدار کی والدہ ماجدہ کے خاندان بنی اسد نے مزار حسینؑ بنانے کی ابتدا کی۔ انہوں نے قبر بنا کر اس پر ایک شامیانہ اور قریب میں ایک بیری کا درخت لگایا۔ ۶۵ھ میں مختار ثقفی نے قبر پر ایک چھوٹا سا مزار تعمیر کرایا اور ساتھ میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ۱۳۲ھ میں ابو عباس عبداللہ بن محمد سفاح نے داخلے کے راستوں پر دو گیٹ تعمیر کرائے۔ ۱۴۰ھ میں عباسی خلیفہ منصور کے دور میں مزار کی چھت اور دیگر حصہ منہدم کروادیا۔ ۱۵۸ھ میں مہدی عباسی نے اس کی تعمیر نو کا اہتمام کیا۔ ۱۷۱ھ میں ہارون الرشید نے عمارت کو ویران کیا، تمام زمین ہموار کروادی اور بیری کا درخت بھی کٹوادیا۔ ۱۹۳ھ میں امین رشید نے حرم کی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ ۲۳۶ھ میں متوکل عباسی نے عمارت کو ویران کردیا اور زمین میں ہل چلوایا۔ ۲۴۷ھ مطابق ۸۶۱ء میں منتصر عباسی نے عمارت کی تعمیر نو کروائی۔ ۲۷۳ھ مطابق ۸۸۶ء میں دوبارہ مزار منہدم کروادیا گیا۔ ۲۸۰ھ میں علوی داعی نے قبر کے اوپر ایک گنبد بنوائی۔ ۳۰۷ھ مطابق ۹۷۰ء میں عضد الدولہ دیلمی نے حرم کے لئے ایک گنبد، چار ڈیوڑھیوں اور ہاتھی دانت سے بنی ضریح کی تعمیر کا اہتمام اور شہر کے لئے برجوں اور فصیل کا انتظام کیا۔ اسی خاندان کے عمران بن شاہین، نے رواق سے متصل اپنے نام

۱۔ کتاب تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۹۶

پر ایک مسجد تعمیر کی۔ ۴۰۷ھ مطابق ۱۰۱۶ء میں دو شمعیں گرنے کی وجہ سے حرم آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ ۴۷۹ھ میں ملک شاہ سلجوقی، نے حرم کے اطراف کی دیوار کی مرمت کروائی۔ ۶۲۰ھ مطابق ۱۲۲۳ء میں ناصر الدین عباسی، نے مرقد امام (ع) کے لئے ایک ضریح بنوائی۔ ۷۶۵ھ مطابق ۱۳۶۵ء میں عراقی سلطان اویس جدایری نے اندرونی گنبد بنوائی اور قبر شریف کے گرد ایک صحن قرار دیا۔ ۷۸۰ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں سلطان احمد اویس نے مزار کے دو مینار تعمیر کروائے۔ ۹۲۰ھ مطابق ۱۵۱۴ء میں ایران کے باشاہ شاہ اسمٰعیل صفوی (اول) نے لحد پر تابوت بنوایا۔ ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۲ء میں عباس شاہ صفوی نے مزار کے تابوت کی کانسہ اور تانبے کی تزئین و آرائش کروائی اور گنبد پر ٹائلیں نصب کروائیں۔ ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۸۳ء میں سلطان مراد چہارم (عثمانی) نے گنبد پر سفیدی کروائی۔ ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں نادر شاہ افشار نے موجودہ عمارتوں کی تزئین کا اہتمام کیا اور حرم کے گنجینے کو بیش بہا عطیات پیش کئے۔ ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں آقا محمد شاہ قاجار نے طلائی گنبد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں فتح علی شاہ قاجار نے چاندی کی ضریح بنوائی اور ایوانوں پر سونے کا کام کروایا۔ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ناصر الدین شاہ نے مزار کے صحن کو مزید وسعت دی۔ ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں بوہرہ داؤدی خاندان کی جانب سے مزار کی دیواروں پر چاندی کی ملمع کاری کراوئی گئی جس پر سونے کا کام کیا گیا تھا۔[1]

پروفیسر عراق رضا زیدی آدمی سینتھلی نے اپنے ایک سلام میں کربلا کی لفظی تصویر نظم کی ہے:

وہ جو کربلا تھی ستم نما، وہی کربلا ہے ارم نما
جہاں چہرہ دیں کا تھا مضمحل، وہیں دیں کا چہرہ گلاب ہے [2]

۱۔ اصلاح محرم نمبر ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۳ء ص ۱۰۰، ۱۰۱ ۲۔ مخطوطہ آدمی سینتھلی نمبر ۱۲ ص ۱۸

اوحدی مراغہ ای نے بھی ایک قصیدہ امام حسینؑ کی شان میں نظم کیا ہے جو روضہ امام حسینؑ کا عکاس ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع اور چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے جا رہے ہیں:

این آسمان صدق و درو اختر صفاست؟
یا روضه مقدس فرزند مصطفاست؟
این داغ سینه اسدالله و فاطمه است؟
یا باغ میوه دل زهرا و مرتضاست؟
ای دیده، خوابگاه حسین علیست این؟
یا منزل معالی و معموره علاست؟
ای جسم، خاک شو، که بیابان محنتست
وی چشم؟ آب ریز، که صحرای کربلاست
ای بر کنار و دوش نبی بوده منزلت
قندیل قبۂ فلکی خاک این هواست
تو شمع خاندان رسولی به راستی
پیش تو همچو شمع بسوزد درون راست
بر حالت تو رقت قندیل و سوز شمع
جای شگفت نیست، نشانی ازین عزاست
قندیل ازین دلیل که: زردست روشنست
کو را حرارت از جگر ماتم شماست
هر سال تازه می شود این درد سینه سوز
سوزی که کم نگردد و دردی که بی دواست [۱]

اکثر ائمہ اثناعشری نے زیارت قبر حسینؑ کی اہمیت بیان کی ہے۔ اس سر زمین کو جو حسینؑ کی شہادت سے پہلے بیابان جنگل تھی وہ شرف، وہ مرتبہ عطا ہوا جو لائق رشک ہے اور یہ سب

۱۔ دیوان اوحدی مراغہ ای، ص ۴

حسین اور ان کے باوفا اصحاب کی بنا پر ہے۔اب ترجیع بند کا یہ بند ملاحظہ کیجئے:

تابعرش از درایں روضۂ عالی راهیست
بر درش هرمَلک از سجده ترقی خواهیست
چرخ قندیل درو حلقۂ بالش ماهی ست
مرقدِ محترم مشهد والا جاهی ست
بی ادب پامنه اینجا که عجب درگاهی ست
سجده گاهِ ملک و روضۂ شاهنشاهی ست[1]

مرزا دبیر کے مطابق اس روضے کے دروازے سے خلد بریں کے لیے راہیں کھلتی ہیں یعنی یہاں سے جنت کی راہ ملتی ہے۔ملائک وفرشتگان اس روضے پر آ کر سجدہ تعظیمی بجا لاتے ہیں اور وہ ملائک کوئی نیا کام نہیں کر رہے کیوں کہ سید الملائکہ اس روضہ میں سونے والے کا گہوارہ جھلانے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔مصرع ثالث میں مرزا صاحب نے مبالغہ سے کام لیا ہے فرماتے ہیں آسمان اس روضے کی قندیل ہے اور اس کی کنجی چاند ہے یعنی یہاں اس قدر نور ہے کہ چاند کی روشنی بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔اور کیوں نہ ہو آخر یہ اس کا روضہ ہے جو رحمۃ للعالمین کا جگر پارہ ہے۔جس کو دیکھ کر رسول کریمؐ کے دل کو سکون ملتا تھا نبی کریم جس کو بے انتہا عزیز رکھتے تھے۔اس دروازے پر بے ادب لوگوں کے قدم رکھنے کی گنجائش نہیں ہے یہ کوئی معمولی در نہیں ہے یہ تو ملائکہ کی سجدہ گاہ اور شہنشاہ عالی مقام کا روضہ ہے۔

بشفا خاک درِ پاک سریع التاثیر
بهرِ دفع غش هر قلب بحکم اکسیر
از اجابت دهن در بدعا گشته بشیر
لوحِ محفوظ مهر زد زکنایه تفسیر
پادر ینجا بادب نه که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملک وروضۂ شاهنشاهی است[2]

۱۔مصحف فارسی،ص ۲۱۰　　۲۔ایضاً،ص ۲۱۰

کربلا کی خاک کو خاک شفا کہا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں امام حسین اور اصحاب با وفا کا خون بہا جو زمین کربلا میں جذب ہو گیا۔ امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق کربلا واقعہ عاشورہ سے پہلے بھی باعظمت تھی کیوں کہ اس سرزمین پر صرف امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کا خون نہیں گرا بلکہ کچھ انبیاء علیہم السلام اور ان کی اولاد کی قبریں بھی اسی سرزمین میں ہیں۔ شہادت حسینی کے بعد اس کی عظمت و رفعت میں چار چاند لگ گئے۔ خاک کربلا خاک شفا سے بھی مشہور و معروف ہے یہ خاک اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا دبیر نے بہت خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

نقش پیشانئ ہر کس کہ قدر زد بسرشت
کلکِ تقدیر بہ پیشانئ آن در بنوشت
سرنوشتِ ہمہ در صفحۂ ہر خشتِ بہشت
ہر کسی سر نہد اینجا بزمیں ہمچون خشت
بی ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہی است
سجدہ گاہِ ملک روضۂ شاہنشاہی است[1]

دست قدرت نے ہر کسی کی تقدیر کا فیصلہ اس کی تخلیق کے ساتھ ساتھ کیا ہے ہر کسی کا رزق خداوند کریم نے متعین فرما دیا ہے۔ اب یہ صاحب تقدیر پر ہے کہ وہ اپنے مقدور کو نیکی سے حاصل کرتا ہے یا بدی سے۔ جو خاصان خدا ہیں وہ خدا کے سامنے بصد عجز و انکساری اپنا سر خم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خدا نے ان کے خمیدہ سروں کو معراج عبودیت عطا کرتے ہوئے اپنے خاص مراتب و مناصب سے سرفراز کیا ہے۔ بارگاہ الٰہی میں جو جتنا ادنی بن کے آتا ہے وہ اتنا ہی اعلی مقام پاتا ہے۔ قرآن مجید میں خداوند قدوس نے صاحبان ایمان کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے:

"**یا ایہا الذین اٰمنوا وابتغوا الیہ الوسیلہ**" اے صاحبان ایمان خدا تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو۔[2]

۱۔ مصحف فارسی، ص۲۱۲ ۲۔ سورہ مائدہ آیت ۳۵

خداوند کریم ذات تک ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہیں ہے اس کے لئے خدا نے کچھ خاص ذوات مقدسہ کو ہمارے درمیان وسیلہ بنا کر بھیجا ہے جن کے ذریعہ خدا تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے تصوف میں کسی پیر و مرشد کی ارادت اختیار کرنا لازم ہے کیوں کہ عام انسان میں خدا کی ذات وصفات کو درک کرنے صلاحیت نہیں پائی جاتی وہ ریاضت ومحنت شاقہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مرزا دبیر نے اسی آیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے روضہ امام حسین کو عوام الناس کے لئے تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا ہے کیونکہ یہی وہ شہدائے راہ خدا ہیں جن کا انتخاب خدا نے فرمایا ہے۔ جن انتخاب کو قرآن میں بیان کیا ہے:

"**ان الله اصطفی آدم و نوحا و آل ابراهیم و آل عمران علی العالمین**" بے شک خدا نے آدمؑ کو نوحؑ کو آل ابراہیمؑ کو اور آل عمرانؑ کو عالمین میں منتخب فرمایا ہے۔[۱]

اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے جلال الدین سیوطی نے درمنثور میں روایت کی ہے:

فی قوله و آل ابراهیم و آل عمران.قال هم المومنون من آل ابراهیم و آل عمران و آل یٰس و آل محمد. خداوند عالم کے اس قول میں آل ابراہیم وآل عمران سے مراد آل یٰس اور آل محمد علیہم السلام ہیں۔[۲]

بقول مرزا دبیر کاتب تقدیر نے ہر کسی کی تقدیر معین فرما دی ہے خامہ قدرت سے جبین مخلوق پر لکھ دیا ہے۔ لہذا ہر کوئی بارگاہ الٰہی میں مانند خاشاک سجدہ ریز ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق خدا کے سامنے سر بسجود ہے اور یہی سجدہ ریزی اس کی فلاح و بہبودی کی ضامن ہے۔

مذکورہ بند مرزا دبیر کی عقیدت ومحبت کا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے بہا ادب پارہ ہے۔ جس طرح روضے کی تعمیر میں اینٹوں نے اپنے سروں کو ہمیشہ کے لیے جھکا رکھا ہے اسی طرح ہر کوئی اپنا سر یہاں جھکائے رہتا ہے۔ یہ اچھوتی تشبیہ اور حسن تعلیل ہے جس میں دبیر نے تعمیر ہونے والی اینٹوں کو اس درگاہ پر سر رکھنے اور انہیں کی طرح لوگوں کے سر جھکانے کی راہ نکالی ہے۔ اس

۱۔ آل عمران ۳۳ ۲۔ درمنثور، ج۲، ص۱۸۰

سرزمین میں ہر شخص خشت کی طرح اپنا سر پیش کرتا ہے۔

حق فرستاده برین مقبره از عرش درود
جبرئیل آمده از سدره بجاروب فرود
سرفرو برده ملایک بزمین بهرِ سجود
انبیاً کرده بزواریش از خلد ورود

پا درینجا بادب نه که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملکِ روضۂ شاهنشاهی است [1]

اللہ نے خود تک پہنچنے کے لئے اپنی مخلوق کو حکم دیا کہ مجھ تک آنے کے لئے وسلیہ تلاش کرو۔ قرآن مجید کے سورہ احزاب میں انہیں ذوات پر درود بھیج کر واضح فرما دیا کہ یہی ذوات مجھ تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ مالک کائنات ارشاد فرماتا ہے:

''**ان الله و ملائکته یصلون علی النبی یا ایها الذین اٰمنوا صلو ا علیه و سلموا تسلیماً**۔ بے شک خدا اور اس کے ملائکہ حضرت محمد مصطفیٰؐ پر درود بھیجتے ہیں اے صاحبان ایمان تم بھی ان پر درود بھیجو اور سلام بھیجو جیسا سلام بھیجنے کا حق ہے۔ [2]

جبرئیل امین نے حسنینؑ کی گہوارہ جنبانی کی ہے لہذا سدرہ سے آ کر ان کے روضے پر جاروب کشی بھی کرتے ہیں ملائک ان مقربین الٰہی کے لئے ان کے روضات پر آ کے سجدہ تعظیمی بجالاتے ہیں خود انبیاء علیہم السلام زیارت کربلا کے لیے آتے ہیں۔

''**اخبرنابو نصرعن والده باسناده عن اسامه عن جعفر بن محمد قال هبط علی قبر الحسین بن اصیب یوم سبعون الف ملک یبکون علیه الی یوم القیامة**. ہم کو خبر دی ابونصر نے اپنے باپ سے سنا اور انہوں اسامہ سے اور انہوں نے جعفرؑ بن محمدؑ سے آپ نے فرمایا: حضرت حسین بن علیؑ کی قبر پر

۱۔ مصحف فارسی، ص۲۱۲ ۲۔ ۱۹۹۔ سورہ احزاب آیت ۵۶

جس دن وہ شہید ہوئے ستر ہزار فرشتے نازل ہوئے اور وہ قیامت تک ان پر گریہ کریں گے۔[1]

دفن یک گنجِ شهید انست درین روضه بهم
بیت لحم شهدا هست مراین خا نۂ غم
بار عیسیٰؑ بنهاد است درینجا مریمؑ
خاک اینجا است با عجاز شفا عیسیٰؑ دم

بی ادب پا منه اینجا که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملکِ روضۂ شاهنشاهی است[2]

کربلا میں امام حسین کے روضہ کے قریب گنج شہیداں ہے۔ گنج شہیداں اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں بہت سے شہدا دفن ہوں۔ اس امر کی توضیح مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے۔

"امام سجادؑ (با قدرت امامت و ولایت) به کربلا آمد و بنی اسد را سرگردان یافت، چون که میان سرها و بدن ها جدایی افتاده بود و آنها راهی برای شناخت نداشتند، امام زین العابدین از تصمیم خود برای دفن شهیدان خبر دادآنگاه به جانب جسم پدر رفت با وی معانقه کرد و با صدای بلند گریست ، سپس به سویی رفت و با کنار زدن کمی خاک قبری آماده ظاهر شد، به تنهایی پدر را قبر گذاشت، روی آن نوشت: هذا قبر الحسین بن علی بن ابی طالب الذی قتلوه عطشاناً غریب، سپس به بننی اسد دستور دادتا دو حفره آماده کنند، در یکی ا زآنها بنی هاشم و در دیگری سایر

ا۔ مصحف فارسی، ص۲۱۳ ۲۔ غنیۃ الطالبین، ص۴۴۳

شهیدان را به خاک سپردند، نزدیکترین شهیدان به
امام حسینؑ فرزند شان علی اکبرؑ است'۔ا

اس روایت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام حسین کے مرقد کے پاس ہی دوسرے شہدا کی قبریں بنی ہوئی ہیں جسے مرزا دبیر نے مصرع اولی میں گنج شہیداں کہا ہے۔ دوسرے مصرع میں ''بیت الحم'' کا ذکر ہے جو کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی جاے ولادت ہے تیسرے مصرع میں زمین کربلا کو جناب مریم سے تشبیہ دی ہے مریم وہ معصومہ ہیں جنھوں نے اپنے بطن میں ایک معصوم یعنی حضرت عیسیٰ کو رکھا اور کربلا وہ جگہ ہے جس میں کئی معصوم دفن ہے۔ حضرت عیسی کا یہ معجزہ تھا کہ وہ لوگوں کو شفا دیتے تھے اسی طرح خاک کربلا بھی لوگوں کو شفا دیتی ہے۔

موسیٰؑ آنجا بعصا آمد و دربانی کرد
جبرئیلؑ از پرِخود مروحه جنبانی کرد
چشمِ یعقوبؑ ازین مقبره نورانی کرد
ایزد از آیهٔ تطهیر ثنا خوانی کرد
بی ادب پامنه اینجا که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملک روضهٔ شاهنشاهی است ۲

مذکورہ بند میں مرزا دبیر نے پے در پے تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ جناب موسیٰ نے جناب شعیبؑ کی بکریاں چرائی تھیں جس کے عوض میں حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰ سے کیا تھا۔ قرآن کریم میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ سورہ بقرہ، سورہ طہ ارسورہ قصص میں خدا نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سورہ طہ میں خدا جناب موسیٰ سے مخاطب ہوکر سوال کرتا ہے:

''وما تلک بیمینک یا موسیٰ قال هی عصای اتوکئوا علیها و اَهُشُّ بها علی غنمی و لی فیها مآرِبُ اخریٰ''. اللہ نے پوچھا اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے تو موسیٰ نے کہا یہ میرا عصا ہے میں اس پر تکیہ کرتا ہوں اس سے اپنی

ا۔ کامل الزیارات، باب ۳۸، روایت ۴ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۲۱۶

بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اس کے علاوہ اس میں میرے
لئے دیگر فوائد بھی ہیں۔[1]

جبرئیل امین ایک ملک ہیں اور وہ بچپن میں حضرات حسنین کا جھولا جھلایا کرتے تھے یعنی رسول کریم کے نواسوں کی خدمت کو مایہ افتخار گردانتے تھے لہٰذا روضہ امام حسینؑ پر آ کر اپنے پروں کو ہلا کر پنکھا کرتے ہیں۔ جناب یعقوب کی آنکھیں فراق یوسف میں گریہ کرنے سے سفید ہو گئی تھیں ان کی آنکھوں کی روشنی زائل ہو گئی تھی۔ جناب یوسفؑ کی قمیص جب جناب یعقوبؑ کی آنکھوں پر ڈالی گئی تو آپ کی روشنی لوٹ آئی۔ اس واقعہ کو پروردگار نے قرآن مجید میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور جناب یوسفؑ کے نام پر ایک سورہ نازل فرمادیا جس کی پہلی آیت سے لے کر سو آیات تک جناب یوسف کا ذکر ہے۔ جس میں جناب یوسف اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ میری قمیص لے جا کر بابا کے آنکھوں پر ڈال دو۔ قرآن مجید میں اللہ نے اس واقعہ کو دہرایا ہے:

"**اذهبوا بقميصي هذا فالقوه على وجه ابي يات بصيراً و اتوني باهلكم اجمعين**"۔ میری قمیص لے جا کر میرے والد کی آنکھوں پر ڈالدو تو ان کی بصارت لوٹ آئیگی۔[2]

اللہ نے سورہ احزاب میں اہلبیت محمدؐ کی طہارت و پاکیزگی کا اعلان کر کے ان کی مدح کی ہے قرآن کریم کی آیت ہے:

"**انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت و يطهركم تطهيرا**. بے شک اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ اے اہلبیتؑ تم سے رجس کو دور رکھے اور تمہیں ایسے پاک رکھے جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔[3]

یہی تمام تلمیحات مرزا دبیر نے مذکورہ بند میں استعمال کی ہیں جن سے ان کے قرآنی افکار سے التفات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱سورہ طہٰ آیت ۱۷/۱۸ ۲۔سورہ یوسف آیت ۹۳ ۳۔سورہ احزاب آیت ۳۳

ای عجب کیست درین مقبره لب تشنه بخواب
که فلک گرد سرش چرخ زند چون دولاب
سایلی کاسه بکف چرخ و جودش چو حباب
زاب کوثر لب او کرده جهانرا سیراب
بی ادب پامنه اینجا که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملک روضۂ شاهنشاهی است [1]

مرزا دبیر نے نواسۂ رسولؐ کے روضے کی عظمت بیان کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس مقبرے کے گرد آسمان رہٹ کی مانند گردش کرتا ہے۔ عرش بھی اس روضے کو سلامی دیتا ہے اس مقبرہ کی یہ عظمت وفضیلت اسی تشنہ لب مہمان کربلا کی وجہ سے ہے جس کی ملکیت میں حوض کوثر ہے۔ جس کے جود وسخا کا موازنہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔

خانۂ خاص علیؑ شیر خدا بیت اله
بوراثت ز علیؑ یافت حسین این درگاه
خانه یک خانی و از کعبه بدین روضه آه
صاحب خانه یک و خانه یکی کعبه گواه
بی ادب پامنه اینجا که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملکِ روضۂ شاهنشاهی است [2]

حضرت علیؑ کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی اس پر تمام مورخین متفق ہیں اسی لئے مرزا دبیر نے خانہ کعبہ کو خانہ علیؑ کہا ہے یعنی علیؑ کا خاص گھر بیت الہ ہے اور امام حسینؑ آپ کے فرزند ہیں تو میراث کے طور پر حسین کو خانہ کعبہ ملا ہے یعنی خدا کا گھر حسین کا بھی گھر ہے حسین وارث کعبہ ہیں۔ لیکن افسوس کہ کہاں خانہ خدا اور کہاں کربلا کا میدان جہاں آج حسین کا قیام ہے۔ وارث کعبہ نے کربلا کی زمین کو آباد کیا اور اس ویرانے کو گلستان بنا دیا۔ یہ روضہ اور کعبہ دونوں ہی روضے کی

۱۔ مصحف فارسی، ص ۲۱۷ ۲۔ مصحف فارسی، ص ۲۱۸

فضیلت کے گواہ ہیں ۔ اس لئے اس بارگاہ کی عظمت بھی کم نہیں کیوں کہ یہ واث کعبہ کا مدفن ہے ۔

بدر کعبه علیؑ را ست شب و روز قیام
می رسد هر چه بگوش ودلش از حقِ پیام
حسب فرموده حق می دهد آن را انجام
جز در کعبه ندارد در این درگهه نام
بی ادب پامنه اینجا که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملکِ روضۂ شاهنشاهی است[1]

پہلے بند کا مضمون ہی مسلسل ہے۔حضرت علیؑ کو شب و روز کعبہ سے سروکار تھا اور جو بھی حکم الٰہی ملا اس کو سرانجام دیا۔مرزا دبیر کے مطابق حضرت علی شب و روز خانہ کعبہ کے گرد رہتے تھے اور جو بھی حکم الٰہی ملتا تھا اس کو انجام دیتے تھے لیکن تواریخ اس کے بر خلاف نظر آتی ہیں کیوں کہ ہجرت کے بعد رسول کریمؐ اور ان کے جاں نثار و وفادار اصحاب آپ کی معیت میں مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ لوٹ کر جانا ہوا اس کے بعد بھی جو مدینہ میں آباد ہو گئے تھے وہ مدینہ ہی میں رہے۔خود رسول کریمؐ اور ان کے اہلبیتؑ مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے اور اکثر اپنے آخری لمحات تک مدینے ہی میں رہے جس کا بین ثبوت روضہ رسول ہے جو مدینہ کو منور و محترم بنائے ہوئے ہے۔ رسول کے علاوہ آپ کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ اور بڑے نواسہ امام حسنؑ کی قبر بھی مدینے میں ہے۔ان تمام شواہد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا دبیر نے کعبے سے رسول کریم کی ذات با برکات مراد لی ہے اور کعبہ کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ حضرت علیؑ ہمیشہ نبیؐ اکرم کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔اس لحاظ سے روضہ امام حسینؑ رسول اکرمؐ تک پہنچنے کا دروازہ ہے۔

اس کے بعد مقطع کا بند ہے:

---

[1] مصحف فارسی، ص۲۱۹

نقش آن بسته یدِ قدرت و کلکِ تقدیر
وصف آن ساخته برصفحهٔ عالم تحریر
حرف مدحش چه زند نقش بقرطاس دبیر
خامه کن با قدمِ سر تو درین راه مسیر
پادراینجا بادب نه که عجب درگاهی است
سجده گاهِ ملکِ روضهٔ شاهنشاهی است[1]

مذکورہ بند میں مرزا دبیر نے خلاصہ کلام پیش کیا ہے۔ یعنی اس روضے کی سب سے بڑی عظمت وفضیلت یہ ہے کہ دست قدرت اور قلم تقدیر نے اس روضے کا نقشہ بنایا ہے اور اس کی صفات صفحہ عالم پر تحریر کی ہیں۔ اس روضے کی ان تمام صفات بیان کرنے کے بعد بھی مرزا صاحب فرما رہے ہیں کہ اس روضہ کی وصف نگاری کرنا اس کی تعریف و توصیف بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں لہذا ہم کلامی میں کہتے ہیں کہ اپنے قلم کو اٹھا کر رکھ دو تم سے اس کی تعریف بیان نہیں ہو پائے گی۔

ان مصرعوں کے بعد بیت الگ ہی مزہ دے رہی ہے۔ جس روضے کی یہ تمام صفات ہیں وہ معمولی مقام نہیں ہے بلکہ ملائکہ کی جاے سجدہ ہے شہنشاہ کون ومکان کا مدفن ہے لہذا اس دیار میں قدم رکھنے سے پہلے اس مکان کی عظمت و توقیر جان لینا اشد لازم ہے تاکہ بے ادبی کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ مرزا دبیر کی انکساری قابل تحسین ہے۔

☆☆☆☆☆

۱۔ مصحف فارسی، ص۲۱۹

شمس المشرقین

ہفت بند پر تضمین کا سلسلہ فارسی شاعری کا طرہ امتیاز ہے اس ذیل میں محتشم کاشانی وغیرہ کے نام بھی سرفہرست ہیں جنہوں نے حسن کاشی کے اشعار پر تضمین موزوں کی ہیں۔ ہندوستان کے شعرا بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں خود مرزا دبیر نے بھی حسن کاشی کے ابیات پر تضمین موزوں کر کے اپنا نام فارسی دنیا میں روشن کیا ہے۔

حسن بن محمود حسن کاشی نے اپنی شاعری فضائل و مصائب اہلبیت بیان کرنے کے لیے وقف کر دی تھی جو اپنے 'ہفت بند' کے لیے معروف ہیں۔ ان کے ہفت بند کی مقبولیت کی دلیل اس سے بڑی اور کیا ہوگی کہ ایرانی شعرا نے ان کے اتباع میں ہفت بند نظم کئے تو ہندوستان میں مولوی سید نثار حسین عظیم آبادی، رتن سنگھ زخمی وغیرہ نے ہفت بند کو تضمین کیا۔ لیکن جو تضمین مرزا دبیر نے ''شمس المشرقین'' کے زیر عنوان قلمبند کی وہ لا جواب ہے اور تضمین کے سبھی لوازمات کو پورا کرتی ہے۔ کتاب ''المعجم فی معاییر اشعار العجم'' میں شمس قیس رازی نے تضمین کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

''تضمین دو نوعست نوع اول آنست که تمام معنی بیت اول به بیت دوم متعلق باشد و بر آن موقوف و آن بیت را مضمن خوانند و ضمان مال در شریعت آنست که کسی ذمت خویش را در تعلق دین با ذمت مدیون بیوندز و گویند در ضمان خدا باش یعنی بحفظ خدا پیوسته باش و بحکم آنکه استاذان صنعت گفته اند که شعر چنان می باشد که هر بیت بنفس خویش مستقل

باشد و جز ترتیب معانی و تنسیق سخن بیکدیگر محتاج نباشد بدین جهت تضمین را شمرده اند پس هر چند این احتیاج و تعلق بیشتر بود بیت معیوب تر بود . فی الجمله این معنی در اشعار عرب بیستر تواند بود برای آنکه در شعر که از یک کلمه بعضی قافیت مصراع اول می شود و بعضی اول مصرع دوم چنانکه گفته اند:

لم ابکِ للاظعانِ و لَکْ ام لِرَس

مِ مُقفرٍ اَوحَش منهم و درس

کلمه لرسم را دو نیمه کرده است و رس را قافیه درس ساخته و میم را از آخر لرسم باول مصرع دوم برده و شک نیست که این جنس مضمن قبیح باشد''۔[۱]

اس سے مزید اگلے صفحہ پر تحریر ہے:

''و نوع دوم از تضمین آنست که بیتی را یا مصراعی از شعر دیگران در شعر خویش درج کند و این نوع اگر در موضع خویش متمکن باشد و در عذابت و رونق ماقبل بیفاید آنرا پسندیده دارند''۔[۲]

'انواع شعر فارسی'' میں تضمین کی تعریف ان الفاظ میں مندرج ہے:

''تضمین عبارت است از آنکه شاعر در ضمن اشعار خود یک مصراع یا یک یا دو بیت را بر سبیل تمثل و عاریت از شعرای دیگر بیاورد و نام آن شاعر را نیز ذکر کند، بنحوی که بوی سرقت و انتحال ندهد''۔[۳]

۱۔المعجم ص۲۹۰/۲۹۱ ۲۔المعجم ص۲۹۵ ۳۔انواع شعر فارسی، ص۶۴۴

ڈاکٹر منصور رستگار فسایی مزید لکھتے ہیں:

"اصطلاح مربع و مخمس و مسدس و امثال آنرا در مورد تضمین نیز بکار می برند که داخل در نوع مسمطات می شود، و به این معنی که مثلاً غزلی را از سعدی یا حافظ تضمین کرده با ضمیمه کردن ابیاتی که هموزن و همقافیه مصراعهای اول اشعار آن غزل باشد آنرا به صورت مسمط چهار مصراعی یا پنج مصراعی و شش مصراعی در می آورند، این نوع تضمین در قدیم معمول نبوده و مخصوص عده ای از شعرای متأخر است"۔[1]

مولانا نجم الغنی رامپوری نے تضمین کی تعریف اس طرح کی ہے:

"تضمین اسے کہتے ہیں کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا پورا شعر یا مصرع کا ٹکڑا لے کر اپنے کلام میں باندھے اور اس کا نام بھی لکھ دے اور اس طرح نام لے دینے سے کوئی سرقے کا گمان نہیں کرتا۔ کبھی پورے شعر اور اس سے زائد کی تضمین کو استعانت کہتے ہیں اور مصرع سے کم کی تضمین کو "ایداع" اور "رفو" بولتے ہیں اور اگر تضمین میں تھوڑا سا تصرف بھی کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر تغیر کثیر مضر ہے کیوں کہ تضمین سے نکل کر سرقہ میں داخل ہو جائے گا"۔[2]

مرزا دبیر نے یہ تضمین صفوی دور کے معروف شاعر ملا حسن کاشی آملی متوفی ۲۶ے ھ کے ہفت بند پر کی ہیں۔ ملا حسن کاشی کا تعلق کاشان سے ہے لیکن زندگی کی پہلی رونق آمل میں دیکھی یعنی ولادت آمل میں ہوئی اسی لئے آملی و کاشی دونوں استعمال کیا جاتا ہے۔ دیوان حسن کاشی

۱۔ انواع شعر فارسی، ص ۶۴۵ ۲۔ بحر الفصاحت، ص ۱۵۹۷/۱۵۹۸

کے مقدمہ میں تحریر ہے:

”شیخ حسن کاشی ، شاعری است بر جسته که تمام ذوق و هنر خود را در سرایش اشعاردر ستایش امیر المومنینؑ سپری کرده است.این شاعر در عصری وارد میدان ادب شیعی شد که سلطان محمد خدا بنده نیز تمایل شیعی خود را آشکار کرده و نیازمند آن بود تا علمان و ادیبان در دو بخش فقه و ادب به کمک وی بشتابند.شاه طهماسپ یکی از شیفتگان او بود و همو بود که مزار را در کنار گنبد سلطانیه تعمیر و آباد کرد۔[1]

محتشم کاشانی نے ملا حسن کاشی کی جو مدح کی ہے وہ اس کے لئے سند بھی ہے اور اس کے دیوان کا حصہ بھی بن چکی ہے:

فصیح بلبل خوش لهجه کاشی مداح
که بود روضه آمل ازو ریاض ارم
به مدح شاه عدو بند از مهارت طبع
چو داد سلسله هفت بند دست به هم [2]

محتشم کاشانی کے علاوہ دیگر شعراء میں رفیعی ، سالک قزوینی،فیاض لاہجی وغیرہ نے ملا حسن کا اتباع کرتے ہوئے ہفت بند کہنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان میں مولوی سید نثار حسین عظیم آبادی، راجہ الفت رائے الفت اور رتن سنگھ زخمی اور مرزا دبیر نے ہفت بند پر تضمینیں کہی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفت بند کی شہرت ہندوستان میں بھی کم نہ تھی۔لیکن مرزا دبیر کے علاوہ دیگر شعرا کی تضمینیں مکمل طور پر دستیاب نہیں ہیں۔مرزا دبیر کی زندگی ہی میں ان کی نظم کردہ تضمینیں بعنوان ”شمس المشرقین“ مطبع یوسفی دہلی سے ۱۲۸۰ھ میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے شاید شائع ہو جانے کی بنا پر ہی یہ ابھی تک باقی ہے۔

۱۔دیوان حسن کاشی،ص ۷/۸ ۲۔دیوان حسن کاشی،ص ۱

جس وقت یہ تضمین شائع ہوئی تو شعراء نے تاریخ نظم کرکے داد و تحسین سے نوازا۔ انہیں تاریخوں میں سے کچھ تواریخ بطور نمونہ نقل ہیں کیونکہ یہ تاریخیں اس تضمین کی اولین تقاریظ اور تنقیدیں ہیں۔ مولوی شیخ بہادر حسین متخلص بہ وحیؔد نے جو تاریخ نظم کی ہے اس میں دبیؔر و حسن کاشی دونوں کی تعریف کرتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے کا ہم پلہ قرار دیا ہے:

خوشا تصنیف مداحان مقبول
که مثلش دیدۂ عالم ندیده
یکی منظومه مقبول کاشیؔ
دگر نظم دبیر حق رسیده
پسند خوشدلان مثل دل و روح
عزیز مردمان مثل دو دیده
بتاریخش جداگانه دو مصرع
وحیؔد از عالم بالا شنیده
دو بدرِ کاملان آشیان عرش
"دو شمس شاعران برگزیده"

۱۲۸۰ھ [1]

مولوی عبدالوہاب متخلص بہ تائبؔ نے جو تاریخ نکالی ہے تو اس کی ردیف ہی نام دبیؔر ہے۔ جس سے شاعر کی مرزا دبیؔر سے عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ تائبؔ نے تاریخ کا جو مطلع کہا ہے اس میں صنعت ردالعجز کا استعمال کرکے کلام میں خوبصورتی پیدا کردی ہے اور مطلع ہی میں اپنی انکساری کا ثبوت دے دیا ہے:

دبیؔر آنکه ندیدش نظیر چشم فلک
ثنای او نتوانم منم خجل ز دبیر

---

[1] شمس المشرقین ص ۳۹، مطبع نولکشور

ترا و در لبش اعجاز دمبدم که بود
فیوض مبدع فیاض متصل ز دبیر
ترشح قلمش بسکه خیر محض بود
عطارد آمده صد بار منفعل ز دبیر
بآب و تاب چو تخمیس بند کاشی کرد
شد است پنجه خورشید مضمحل ز دبیر
رقم زد از پئ تاریخ طبع آن تائب
"چه این مخمس مقبول اهل دل ز دبیر"

۱۲۸۰ء[۱]

مفتی میر عباس متخلص بہ ضوعفؔ

بر آن هفت بندی که از کاشی است
که در هفت اقلیم گشته شهیر
مخمس ز مرزا سلامت علی
مسلم شده بر صغیر و کبیر
عجب هفت کرده بران هفت بند
که ای کاش میگشت کاشی خبیر
چون آن خمسه در قالب طبع ریخت
قلوب محبان ازان شد خمیر
ثنا خوان این خمسه از چار سو
کلیمؔ و سلیمؔ انوریؔ و ظهیرؔ
رقم کرد سید بتاریخ آن
"ز هی خمسه از طبع مرزا دبیرؔ"

۱۲۸۰ء[۲]

۱۔ شمس المشرقین ص ۳۹، مطبع نولکشور ۲۔ ایضا

منشی عابد علی متخلص بہ ہمتا

ذاکر حضرت شبیر دبیرؔ
در فصاحت که نظیر سحبان ست
از بیانش همه معجز رقمی
در کفِ قدرت کلک دو زبان ست
بر کلام حسنؔ کاشی ازو
شد مخمس که همه حسن بیان ست
طبع آن کرد سعادتمندی
که علی هم حسن اورا به قرآن ست
سال مطبوع مخمس هاتف
"گفت این پنجه مهر تابان ست"

۱۲۸۰ھ[1]

مولوی صفدر حسین نے شمس الضحیٰ میں ہفت بند کے متعلق مرزا دبیر کے خیالات اور تضمین کی توجیہ بیان کی ہے:

"روزی تذکره این مخمس فیما بین مسود اوراق و آن خلاصه آفاق آمد عرض کردم که اگر کاشی مغفور یک بیت در منقبت نظم نموده است جناب یک و نیم بیت بازاء آن منظوم فرموده اند و آن مرحوم مضامین را بانضراد منظوم ساخته و جناب عالی بارتباط مضامین نفیس خود با مضامینش پرداخته و سلوک این وادی نسبت به وادی اول بسیار صعب و دشوار و در طی این طریق خون جگر خوردن و دماغ سوزی بسیار از غایت

ا۔ شمس المشرقین ص ۳۹، مطبع نولکشور

انکسار و هضم نفس و دینداری که شیوه مرضیه عاشقان جناب باری باشد. فرمود که کلامم بحسن کلام بلاغت نظامش نمیتوان رسید و حسن قبولی که نظمش را میسر گشت بنظم کی حاصل خواهد گردد و من بخیال این امر که ابیات هفت بند مقبول گشته اند آنرا مخمس نموده ام که گفته اند هر چه در کان نمک رفت نمک شد و ذلک من محاسن صفاته ابد الله فیوض افاداته"۔ [1]

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملا حسن کاشی کا یہ ہفت بند ہندوستان میں کافی مقبول تھا۔ مرزا دبیر کے یہ جملے کہ "میرا کلام ملا حسن کاشی کے کلام کی خوبی تک نہیں پہنچ سکتا میں نے یہ سوچ کر ان اشعار کو مخمس کیا کہ یہ اشعار بے حد مقبول ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے جو چیز بھی نمک کی کان میں جاتی ہے وہ نمک بن جاتی ہے یعنی اس مقبول ہفت بند کو تضمین کرنے سے میری محنت و کاوش بھی مقبول ہو جائے گی" مرزا دبیر کی نظروں میں ہفت بند کی اہمیت کو بیان کر رہے ہیں۔

شمس المشرقین کے دو جداگانہ نسخے دستیاب ہوئے ہیں ایک تو ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی کتاب "مصحف فارسی" میں شامل کر لیا ہے جو نبیرہ دبیر محترم گوہر دبیری کے پاس موجود نسخہ سے ماخوذ ہے۔ دوسرا نسخہ رامپور رضا لائبریری رامپور کے شعبہ خاص سے دستیاب ہوا جس کے آخر میں شعراء کے ذریعے نکالے گئے تاریخی قطعات اشاعت بھی شامل ہیں۔ خستہ حال ہونے کی بنا پر اس نسخہ تک آسانی سے رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ دونوں نسخوں میں متعدد مقامات پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔

مرزا دبیر نے مخمس کی ہیئت میں اس ہفت بند پر تضمین کی ہے اور ہفت بند کے اشعار کو بیت کی صورت میں ایسی مہارت اور نفاست سے استعمال کیا ہے کہ پڑھنے پر

۱۔ شمس الضحیٰ، ص ۱۰۱

تضمین کا گمان نہیں ہوتا بلکہ دبیر ہی کا کلام لگتا ہے۔ فارسی الفاظ ومحاورات کی ترکیب، نشست و برخاست اتنی دلکش ہے کہ لگتا ہے یہ کسی صاحب زبان کی تخلیق ہے، اور ہو بھی کیوں نہ اجداد جو شیرازی ہیں۔ اس تضمین میں صنعت ''تنسیق الصفات'' کی بہتات ہے بلکہ اکثر بند اسی صنعت سے لبریز ہیں۔ مرزا دبیر نے اس تضمین میں آیات و احادیث سے بھی خاصہ استفادہ کیا ہے کہیں کہیں ایک دو لفظ اور کہیں کہیں آدھی یا اس سے زیادہ آیات و احادیث نظم کی ہیں ہفت بند کے پہلے شعر پر مرزا دبیر نے ۱۳ بند نظم کئے ہیں بعدہٗ کسی پر چار کسی پر تین اکثر ابیات پر ایک ایک بند ہی نظم کیا ہے۔ ہفت بند کا مطلع اس قدر جاندار ہے کہ مرزا دبیر نے اس پر ۱۳ بند تضمین کر دئے۔ تمام بندوں پر گفتگو کرنا طوالت کو دعوت دینا ہے لہذا چند مخصوص بندوں پر شاعر کی فنکارانہ مہارت موضوع بحث بنائی جا رہی ہے۔

اس تضمین کے پہلے بند کا پہلا حرف ''السلام'' ہے اردو سلام کی تعریف میں یہ بات بھی مندرج ہے کہ ابتدائی سلام کے شروع میں یا بطور ردیف آخر میں سلام، السلام یا سلام ہو جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا تھا بعد میں ان الفاظ کی جگہ مجرئی وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی کیا جانے لگا۔ میر انیس اور خود مرزا دبیر کے متعدد اردو سلام انہیں الفاظ سے شروع ہوتے ہیں یا ان الفاظ کا کسی نہ کسی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا پہلی نظر میں اس تضمین پر سلام کا گمان ہوتا ہے کیوں کہ سلام کی بھی کوئی ہیئت نہیں ہے آج بھی اردو سلام مثنی، مثلث، مربع، مخمس اور مسدس تمام ہیئتوں میں نظم کیے جاتے ہیں۔ جن کا شمار نعت ومنقبت میں کیا جاتا ہے۔ لیکن جو صنف سخن کی حیثیت سے ''سلام'' غزل کا بدل ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ صنف سخن ہر طرح سے غزل کی طرح ہے سوائے اس کے کہ اس میں مذہبی اور اخلاقی مضامین کے علاوہ کسی اور مضمون کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس تضمین کا موضوع مدح مولا علیؑ ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا مضمون اس میں شامل نہیں ہے۔ یہ تضمین صنف سلام نہیں ہے اس بیت میں نور خدا و نور مصطفیؐ کے حقیقی نور کے علاوہ تخلیق خدا بہ وجہ محمد

حبیب اللہ، جوشئ کائنات کی ہر شئ سے زیادہ روشن اور کائنات کو روشن کرنے والی ہے وہ ہے آفتاب۔ جس کے مترادف الفاظ خورشید، سورج وغیرہ ہیں۔ اس شعر میں اسی تابناک روشنی کی بنیاد پر اس سورج کو جو کائنات کو روشنی بخشتا ہے جسے عالمین کے پالنے والے نے خلق کیا ہے لیکن اس کا نور دراصل نور خدا سے خلق رسول خدا کے نور کا پرتو یا سایہ ہے اسی لئے یہ آفتاب نہایت افضل و برتر عظمت کا حامل تابناک اور سخاوت کا منبع اور دین کی روشنی ہے۔ ایسے بلند مضمون کے حامل اس بیت کو پسند کر کے مرزا دبیر نے اس پر تضمین کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

السّلام ای سایه ات خورشیدِ ربّ العالمین
آفتاب عِزّ و تمکین آفتابِ داد و دین

بند اول

السّلام ای مجمع البحرین ایمان و یقین
السّلام ای مرجعِ آیاتِ قُرآنِ مبین
السّلام ای نورِ عینِ طا و ها ویا وسین
السّلام ای سایه ات خورشیدِ ربّ العالمین
آفتاب عِزّ و تمکین آفتابِ داد و دین[1]

پہلے بند کے مصرع اولی میں ''مجمع البحرین''قرآنی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں ایمان و یقین کے دو دریا مولاے کائنات کی ذات میں یکجا ہونا بیان کیے گئے ہیں۔مصرع دوم میں''مرجع آیات قرآن مبین''کہہ کر قرآنی آیات کا محور و مرکز ذات علی کو قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات حضرت علی سے متعلق ہیں جن میں:

آیت ولایت'' انما ولیکم الله و رسوله والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلاة و یؤتون الزکاة و هم راکعون''

تمہارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز

۱۔شمس المشرقین، مرزا دبیر،ص۲

قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔[1]

آیت تطہیر" **انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت و یطهرکم تطهیرا**". بے شک اللہ کا ارادہ ہے کہ ہر طرح کی ناپاکی کو اہل بیت! آپ سے دور رکھے اور آپ کو ایسے پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔[2]

آیہ مباہلہ" **فمن حاجک فیه من بعد ما جائک من العلم فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم و نسائنا و نسائکم و انفسنا وانفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله علی الکاذبین**". آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (عیسی کے بارے میں) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی بیٹیوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی بیٹیوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔[3]

آیہ نباء"**عم یتسائلون عن النباء العظیم**". یہ لوگ کس چیز کے بارے میں سوال کر رہے ہیں، کیا اس عظیم خبر کے بارے میں؟[4]

آیہ لیلۃ المبیت" **ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله والله رؤف بالعباد**. اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا جوئی میں اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔[5]

آیہ اتباع:"**یا ایها الذین اٰمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم**". اے ایمان والو اللہ کی

ا۔مائدہ آیت ۵۵ ۲۔احزاب آیت ۳۳ ۳۔آل عمران آیت ۶۱ ۴۔نباء آیت ۱ ۵۔بقرہ آیت ۲۰۷

اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی
اطاعت کرو۔[1]

مذکورہ بالا آیات کے لئے علمائے اسلام متفق ہیں کہ شان حضرت علیؑ میں نازل ہوئیں۔ تیسرے مصرع میں رسول کریمؐ کے القاب کی جانب اشارہ فرمایا۔ طاوھا یعنی ''طہٰ'' یا وسین یعنی ''یٰس''۔ یہ طہٰ و یٰس رسول الثقلینؐ کے مشہور و معروف القاب ہیں یہ دونوں قرآنی الفاظ ہیں اور باقاعدہ الگ الگ سوروں کے نام ہیں۔

ارشاد رسول اکرمؐ ہے:

''**کنت انا و علی نور اً بین یدی الله تعالی قبل ان یخلق آدم باربعة عشر الف عام فلما خلق الله آدم قسّم ذلک النور جزئین فجزء انا و جزء علی**'' میں اور علی نور تھے خدا کے سامنے آدم کی تخلیق سے چودہ ہزار سال پہلے۔ پس اس کے بعد خدا نے آدم کو خلق کیا اور اس نور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جز سے مجھے بنایا اور دوسرے جز سے علی کو۔[2]

السلام ای جلوه تو عرش را کرشی نشین
عرش معراج تو دوش پاک خیر المرسلین
السلام ای نور تو شمع ره خلد برین
السلام ای سایه ات خورشید رب العالمین
آفتاب عز و تمکین آفتاب داد و دین[3]

چونکہ نبی کریمؐ خدا کا نور ہیں لہذا علی مرتضیٰؑ بھی خدا کا نور ہیں فتح مکہ میں رسول اکرمؐ نے اپنے مخالفین کو عام معافی دے دی تھی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے کعبے میں سجے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالا زیادہ اونچائی پر رکھے ہوئے بت کو توڑنے کے لیے حضور نے حضرت علیؑ کو اپنے کاندھے پر سوار کیا اور اس بت کو تڑوا دیا۔ حضرت علیؑ کے قدم دوش نبوت تک آنے کو

۱۔ سورہ نساء آیت ۵۹ ۔ ۲۔ مسند ابن حنبل، ۱۴۳/۵ ۔ ۳۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۳

مرزا دبیر نے علیؑ کی معراج قرار دیا ہے۔ رسول اکرم کی حدیث مبارک ہے:

"قال رسول اللہؐ:یا علی حبک تقوی والایمان و بغضک کفر و نفاق" اے علی تیری محبت تقوی بھی ہے اور ایمان بھی اور تجھ سے بغض کفر بھی ہے نفاق بھی۔[1]

چونکہ علیؑ مولائے کائنات ہیں لہذا آپ کی محبت جنت کی موجب اور آپ سے بغض جہنم کا ایندھن ہے۔ مولائے کائنات کے ذریعہ کی گئی ہدایت جنت کا راستہ ہے یعنی آپ کے ارشادات و فرمودات کی روشنی میں زندگی گزارنے کا نام جنت ہے جس کی اصل وجہ سیرت رسول کا علمبردار ہونا ہے۔

السّلام ای طفلِ ابجد خوانِ تو روح الامین
السّلام ای خالِ تو فهرستِ قرآن مبین
السّلام ای سینه ات گنجینهٔ علمِ یقین
السّلام ای سایه ات خورشیدِ ربِّ العالمین
آفتابِ عِزّ و تمکین آفتاب ِ داد و دین
السّلام ای دستِ تو دستِ قضای راستین
السّلام ای مُرغِ دست آموزِ تو روح الامین
السّلام ای پایه ات عرش آستان کرُسی نشین
السّلام ای سایه ات خورشید ربّ العالمین
آفتابِ عِزّو تمکین آفتابِ داد و دین [2]

مذکورہ بالا بندوں میں جو مضامین مرزا دبیر نے نظم کئے ہیں اسی طرح کے مضامین فارسی کے صوفی شعرا کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً شاہ نعمت اللہ ولی نے مولا علیؑ کی شان میں ایک قصیدہ موزوں کیا جس میں جبرئیل کی حضرت علیؑ سے مدد مانگنے کا ذکر کیا ہے مطلع اور شعر تحریر کیا جا رہا ہے:

۱۔امالی، شیخ صدوق، ص ۷۷ ۲۔شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۳

آن امیر المومنین یعنی علیؑ
وان امام المتقین یعنی علیؑ
استعانت خواهد از درگاه او
خدمت روح الامین یعنی علیؑ
معنی علم لدنی بی خلاف
عالم علم مبین یعنی علیؑ [1]

مرزا دبیر نے اسی واقعہ کی جانب 'طفل ابجد خوان' سے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد تیسرے مصرع میں قرآن پاک سورہ یٰس کی آیت کی جانب اشارہ ہے:

''**کل شیءٍ احصیناه فی امام مبین**''. ہم نے تمام اشیاء کا احصی امام مبین میں کر دیا ہے۔[2]

اور خود رسول اکرم نے فرمایا:

''**انا مدینة العلم و علی بابها**'' میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔[3]

اسی مضمون کو فانی کشمیری نے اپنی مثنوی 'ہفت پیکر' مرزا دبیر سے تقریباً ۲۰۰ سال قبل موزوں کیا ہے:

شهر علم است احمد مختار
درِ آن شهر حیدر کرار
هر که بر گرد از درِ حیدر
در نیابد بچشم پیغمبر [4]

محتشم کاشانی نے بھی اس مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

نزد شهر علم از نزدیک علام الغیوب
چون رسیده جبرئیل از ره تو را در یافته [5]

۱۔ قصیدہ نمبر ۳۱، شاہ نعمت اللہ ولی ۲۔ سورہ یٰس آیت ۱۲ ۳۔ بحار الانوار، جلد ۴۰، ص ۲۰۰
۴۔ مثنویات فانی کا تنقیدی جائزہ، ص ۲۶۲، ۲۶۳ ۵۔ دیوان محتشم کاشانی، ترکیب بند نمبر ۶

حضرت علی نے فرمایا تھا کہ مجھے نبی اکرمؐ نے علم کے ہزار باب سکھائے اور میں نے ہر ایک باب سے ہزار ہزار باب علوم کے کشف کیے۔

"قال علی علیه السلام:لو کشف لی الغطاء ما ازددت یقینا" اگر میرے سامنے سے حجابات ہٹا دئے جائیں تب بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔ یعنی علیؑ کا علم ویقین آخری منزل پر ہے۔[1]

گویا علم حیدری رسول کریم کا عطیہ ہے اسی مضمون کو فردوسی طوسی نے شاہنامہ کی ابتدا میں نظم کیا ہے:

که من شهر علمم علیم در ست
درست این سخن قول پیغمبر ست
گواهی دهم کاین سخنها ز اوست
توگویی دو گوشم پر آواز اوست[2]

مرزا دبیر نے اس بند میں تلمیحات کا بھرپور استعمال کیا ہے:

ای بفیضِ حُسنِ تو یعقوبؑ خوش یوسفؑ حسین
روزِ روشن در جمالی صبحِ صادق درجبین
بر چراغ نور تو پر وانه جبریلِ امین
السّلام ای سایه ات خورشید ربّ العالمین
آفتابِ عِزّ و تمکیں آفتابِ داد و دین[3]

حضرت یعقوبؑ اپنے گریہ کے لئے اور حضرت یوسفؑ اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں لیکن مرزا دبیر نے جو تلمیح استعمال کی ہے اس میں جناب یعقوبؑ کی خوشی اور حضرت یوسفؑ کے حسن کی جانب اشارہ کیا ہے یعنی حضرت علیؑ کے حسن کے فیض سے حضرت یوسفؑ کو حسن ملا اور جب حضرت یوسفؑ کے اس حسن کی خوشبو جناب یعقوبؑ کے مشام تک پہنچی تو آپ کی

۱۔ سفینۃ البحار، ج۲ص۳۴۷ ۔ ۲۔ شاہنامہ فردوسی، آغاز کتاب، ص۳ ۔ ۳۔ شمس المشرقین، ص۳

بصارت لوٹ آئی اور بصارت کا لوٹنا خوشی کا سبب ہے۔علیؑ کے حسن و جمال سے دن روشن ہیں اور صبح صادق کی رونق پیشانی کے نور سے ہے۔اس حیدری شمع کے گرد گھومنے والا پروانہ کوئی عام نہیں ہے بلکہ جبرئیل امین ہے۔

السّلام ای روشن از نورِ تو آدم را جبین
قُد سیاں در سجده اش افتاده یکسر بر زمین
السّلام ای نورِ تو مسجودِ اربابِ یقین
السّلام ای سایه ات خورشید ربّ العالمین
آفتابِ عِزّو تمکیں آفتابِ دادودین [1]

جناب آدم علیہ السلام کو خلق کرنے سے پہلے خدا نے تمام ملائکہ کو حکم دیا تھا کہ جب میں روح پھونک دوں تو سب کے سب سجدہ میں چلے جانا خدا کے حکم کے مطابق سب نے سجدہ کیا مگر ایک شیطان منکر ہوا۔اس واقعہ کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔

"فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعو له ساجدین، فسجد الملائکة کلهم اجمعون". پھر جب میں اس کی تخلیق مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔پس تمام کے تمام فرشتوں نے سجدہ کر لیا۔[2]

"اذ قال ربک للملائکة انی خالق بشراً من طین، فاذا سویته و نفضت فیه من روحی فقعوا له ساجدین،سجد الملائکة کلهم اجمعون".جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں ۔پس جب میں اسے درست بنالوں اوراس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا، چنانچہ تمام کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ [3]

۱۔شمس المشرقین،مرزا دبیر،ص۳　　۲۔سورہ حجر آیات ۲۹،۳۰　　۳۔سورہ ص آیات ۷۱،۷۲،۷۳

جناب آدم کی پیشانی میں جونور تھا دراصل ملائکہ کا یہ سجدہ اسی نور کو تھا۔ مرزا دبیرؔ کہتے ہیں کہ سلام اس پر کہ جس کے نور سے آدم کی پیشانی منور تھی جس کی تابانی سے تمام قدسیان عرش آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔ جو ارباب یقین ہیں وہی اس نور کو سجدہ کرتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومیؔ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں:

تا صورت پیوند جهان بود علیؑ بود
تا نقش زمین بود و زمان بود علیؑ بود
مسجود ملایک که شد آدمؑ ز علیؑ شد
آدمؑ چو یکی قبله و مسجود علیؑ بود
هم آدمؑ و هم شیثؑ و هم ادریسؑ و هم الیاسؑ
هم صالحؑ پیغمبر و داوودؑ علیؑ بود
هم موسیؑ وهم عیسیؑ و هم خضرؑ و هم ایوبؑ
هم یوسفؑ و هم یونسؑ و هم هودؑ علّی بود
موسیؑ و عصا و ید بیضا و نبوت
در مصر به فرعون که بنمود، علیؑ بود
عیسیؑ به وجود آمد و در حال سخن گفت
آن نطق و فصاحت که در او بود علیؑ بود
خاتم که در انگشت سلیمانؑ نبی بود علیؑ بود
آن نور خدایی که بر او بود علیؑ بود [1]

حافظ شیرازی نے اپنی غزل میں اس مضمون کو نظم کیا ہے:

ملک در سجده آدمؑ زمین بوس تو نیت کرد
که در حسن تو لطفی دید بیش از حد انسانی [2]

بوعلی قلندرؒ نے بھی اس مضمون کو نظم کیا ہے:

۱۔ دیوان شمس تبریزی، ص ۲۵۵ ۲۔ دیوان میں ردیف 'ی' میں ۴۷

جمالت بود اندر روی آدمؑ
که می بودش شرف بر جمله آدمؑ
اگر این نقطه دانسته عزرائیل
هزاران سجده آورده دمادم ۱؎

دیگر بند:

اوّل و آخرِ توی از انبیاؑ مثلِ الف
اِبتدا و انتها هم شاهد و هم مُعترف
شُد ز ارشادِ سَلُونی رازِ مخفی منکشف
عالمِ علمِ لَدنّی شهسوارِ لَو کُشِفَ
ناصِرِ حق نفسِ پیغمبرؐ امامؑ متقین
مُنکشِفُ برَ چشم تو نقش و نگارِ لَو کُشِفَ
شُد زانگشتِ زبان فتحِ حصارِ لو کُشِفَ
کاشِفِ رازِ سَلُونی راز دارِ لو کُشِفَ
عالمِ علمِ لدنّی شهسوارِ لَو کُشِفَ
ناصِرِ حق نفسِ پیغمبرؐ امامؑ متقین ۲؎

مرزا دبیر نے مذکورہ دو بند میں جو مضمون نظم کیا ہے وہ بہت وسیع ہے جس پر بہت طویل گفتگو کی جا سکتی ہے۔ حضرت علیؑ کے لئے رسول اکرمؐ کی بہت سی احادیث معروف ہیں جن میں سے ایک حدیث تشبیہ ہے:

''قال رسول اللہؐ: من ارادان ینظر الی اسرافیل فی هیبته و الی میکائیل فی رتبته و الی جبرئیل فی جلالته و الی ادم فی علمه و الی نوح فی خشیته و الی ابراهیم فی خلته و الی یعقوب فی

۱۔ دیوان بوعلی قلندر مع مثنوی، ص ۱۶۹ ۲۔ شمس المشرقین، ص ۳، مطبع یوسفی، دہلی

حزنه و الی یوسف فی جماله و الی موسی فی مناجاته و الی ایوب فی صبره و الی یحیی فی زهده و الی عیسی فی عبادته و الی یونس فی ورعه و الی محمدٍ فی حسبه و خلقه ،فلینظر الی علی، فان فیه تسعین خصلة من خصال الانبیاء جمعها الله فیه ولم یجمعها فی احد غیره''. حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: جو اسرافیل کی ہیبت ،میکائیل کا رتبہ، جبرئیل کا جلال، آدم کا علم، نوح کی خشیت، ابراہیم کی خلت، یعقوب کا حزن، یوسف کا حسن، موسیٰ کی مناجات، ایوب کا صبر، یحییٰ کا زہد، عیسیٰ کی عبادت، یونس کا ورع، اور محمد مصطفیٰؐ کا حسب وخلق ایک جگہ دیکھنا چاہتا ہے وہ علیؑ کے چہرے کی جانب نظر کرے، پس بے شک اللہ نے انبیاء کی خصلتوں میں سے نوے خصلتیں علیؑ میں جمع کر دی ہیں جو کسی بھی دوسری ذات میں نہیں ہیں۔[1]

یعنی حضرت علیؑ میں انبیاء کے ۹۰ فیصدی کمالات یکجا ہیں اسی لئے مرزا دبیر نے اس بند کے مصرع اولی میں کہا ہے کہ انبیاء کی ابتدا و انتہا میں تو ہی ہے۔تو ہی تمام انبیاء کی نبوت کا شاہد ہے۔اور یہ راز علیؑ کے دعوی سلونی سے ظاہر ہو گیا۔حضرت علیؑ نے منبر سے دعوی سلونی کیا تھا جسے صاحب ینابیع المودۃ نے نقل کیا ہے:

''سلونی قبل ان تفقدونی،سلونی عن کتاب الله،وما من آیة الا و انا اعلم حیث انزلت بحضیض جبل او سهل ارض،و سلونی عن الفتن وما من فتنة الا وقد علمت من کسبها و من یقتل فیها''. مجھ سے معلوم کرلو

ا۔ ینابیع المودہ، ج۲ باب ۵۶

اس سے پہلے کہ تم مجھے کھودو مجھ سے پوچھو کتاب خدا کے بارے میں۔ایسی کوئی آیت نہیں کہ جس کی شان نزول میں نہ جانتا ہوں چاہے خشکی میں اتری ہو یا سنگلاخ پہاڑی پر، مجھ سے پوچھو فتنوں کے بارے میں، ان فتنوں کو برپا کرنے والے اور فتنوں میں موت سے ہم آغوش ہونے والوں کے بارے میں۔[۱]

ابن عساکر نے بھی یہ روایت نقل کی ہے:

''انبائنا ابو حنیفه الیمامی الانصاری عن عمیر بن عبد الله قال خطبنا علی (بن ابیطالب) علی منبر الکوفه فقال: ایها الناس سلونی قبل ان تفقدونی فبین الجنبین منی علم جم''. عمیر بن عبداللہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علی نے منبر کوفہ پر خطبہ دیا تو فرمایا اے لوگوں اس سے پہلے کہ مجھے کھودو مجھ سے پوچھ لو، میرے پہلوؤں کے درمیان بہت علم ہے۔[۲]

حضرت علی نے دعوی سلونی کیا تھا یعنی جو پوچھنا ہے پوچھ لو اور اس دعوی کی وجہ وہ علم ہے جو رسول اکرمؐ سے حاصل کیا۔علیؑ کا یہ دعوی سلونی نہ جانے کتنے رازوں سے پردہ اٹھانے والا ہے۔

شست باران ابرئ مشقِ عطایت با صفا
آفتاب اورا نموده خُشک با مهر وفا
کرد برَ ابری رقم طغرا نویسِ هَلْ اَتاَ
صاحِبِ یوفون بالنذر آفتابِ اِنّما
قُرةُ العین لعمرک نازِشِ رُوح الامین

۱۔ ینابیع المودہ، ص ۲۷۴ ۲۔ تذکرہ امیر المومنین علی ابن ابیطالب فی تاریخ دمشق، خسرو قاسم، ص ۱۶۱

مَرجَعِ مِمّارَزَقْنَا یُنفِقُوْن و قُلْ کَفٰی
هَلْ اَتٰی شانِ عَطَایَتْ لَا فَتٰی مَدْحِ وِغا
مَصدر وَالعَصْر مَقْصُوْدِ عَلیّ بابُها
صاحِبِ یوفون بالنذر آفتابِ اِنّما
قُرّةُ العین لعمرک نازِشِ رُوحِ الامین۱

سورہ ہل اتی اہل بیت کی شان میں نازل ہوا تھا"و **یطعمون الطعام علی حبه مسکینا و یتیما و اسیرا**" کی تفاسیر کے ذیل میں مفسرین رقم طراز ہیں:

ابن مردویہ نے اس آیت کے سلسلے میں ابن عباس سے روایت کیا ہے: "یہ آیت علیؑ مرتضی و فاطمہ زہراؑ کی شان میں نازل ہوئی" ۲

قرطبی معروف عالم دین نے بھی یہی روایت نقل کی ہے۔۳

حاکم حسکانی بھی ابن عباس سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چونکہ علیؑ نے اپنا افطار راہ خدا میں سائل کو دے دیا اس لئے خدا نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی۔۴

مذکورہ دونوں بند اسی آیت اور سورہ ہل اتی کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اس کے علاوہ حضرت علیؑ کی ایک اور فضیلت "**لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار** "بھی بطور تلمیح استعمال کی گئی ہے۔شاہ نعمت اللہ ولی کے ایک ترجیع بند کی بیت بھی اسی طرح ہے:

نفس خیر المرسلین است و ولی کردگار
لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار

جنگ احد میں جب حضرت علیؑ نے پوری مستعدی کے ساتھ جنگ کی تو آپ کی تلوار ٹوٹ گئی تب آسمان سے ذوالفقار نازل ہوئی اور یہ آواز بلند ہوئی۔**لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار**.۵

اس واقعہ کا اشارہ قرآن کریم میں بھی ملتا ہے:

۱۔شمس المشرقین،ص ۶ ۲۔فتح القدیر، ج ۵،ص ۳۴۹ ۳۔الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۹،ص ۱۳۰
۴۔شواہد التنزیل لقواعد التفضیل ج ۲،ص ۴۰۶ ۵۔دیوان شاہ ولی اللہ،ص ۵۹۰

"اذ همت طائفتان منکم ان تفشلا و الله ولیهما و علی
الله فلیتوکل المومنون"۔(یہ اس وقت کی بات ہے) جب
تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے حالانکہ اللہ
ان کا مددگار تھا اور مومنین کو چاہئے کہ اللہ پر توکل کریں۔[1]

مرزا دبیر نے مذکورہ ذیل شعر پر چار بند تضمین کئے ہیں:

از عطائ دستِ فیّاض تو دریا مستفیض
وز ریاضِ نزهتِ طبع تورضوان خوشه چین

وہ بند یہ ہیں:

همچو پارس کوه از فیضت سراپا مستفیض
کان سیم و معدن لعل و گهر ها مستفیض
خار سبزه لاله هم صحرا بصحرا مستفیض
از عطا و دستِ فیّاض تو دریا مستفیض
وز ریاضِ نکهتِ طبع تو رضوان خوشه چین[2]

ان بندوں میں الفاظ کا جو انتخاب ہے وہ اپنا جواب آپ ہے مذکورہ بندوں میں ان اشیاء کا ذکر کیا ہے جو حضرت علیؑ سے فیض حاصل کرتی ہیں پہلے بند میں پارس، لعل و گوہر، سبزہ و لالہ اور صحرا کو شامل کیا ہے تو دوسرے بند میں طوبی، فردوس معلیٰ، کعبہ اور طور سینا کا ذکر ہے اور تیسرے بند میں ادنی و اعلی، چاند کی چاندنی، نور کی تابانی، دین و دنیا، ساحل سمندر اور چوتھے بند میں حلم و خاکساری، کوہ و صحرا، شجاعت سے دین، عدل سے دنیا، پیشانی سے مہر مبین اور لب سے مسیحائی مستفیض ہوتی ہے۔ مرزا دبیر نے ان الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے خیال رکھا ہے کہ ان کی تراکیب، نشست و برخاست میں کوئی جھول نہ آنے پائے۔ خاص طور پر اس چیز کو سامنے رکھا ہے کہ جس بند میں لعل و گہر سبزہ و صحرا کی بات کی ہے اس میں چاند کی چاندنی وغیرہ کی بات نہیں کی یعنی عرشی اشیاء کے ساتھ فرشی اشیاء مخلوط نہیں کی ہیں۔ جس بند میں طوبی کا ذکر کیا ہے اس میں

۱۔ سورہ آل عمران آیت ۱۲۲ ۲۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۵

کعبہ اور کوہ طور کا ذکر کیا ہے کسی عام مقام کا نہیں۔ یہی عدالت ہے کہ جس کا جو مقام ہے اسے اسی مقام پر رکھا جائے تا کہ کلام کا حسن برقرار رہے۔

مذکورہ بند میں صنعت مراعات النظیر سے لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مصرعہ ثانی میں کان کے لئے سیم، معدن، لعل اور گوہر نظیر ہیں تو تیسرے مصرعہ میں خار، سبزہ، لالہ، صحرا کے لئے استعمال کئے ہیں۔

بَرگ بَرگ از سایۂ قدِّ تو طوبامستفیض
گُل گُل از بوئ تو فردوس معلی مستفیض
از رُخت کعبه زسینه طورِ سینا مستفیض
از عطا و دستِ فیّاض تو دریا مستفیض
وز ریاضِ نکهتِ طبع تو رضوان خوشه چین [1]

کلام میں صنعت تضاد سے حسن بڑھ جاتا ہے مذکورہ بند کے مصرع اولی میں ادنی اور اعلی تضاد ہے جس سے کلام میں رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

یا علیؑ از جودِ تو ادنیٰ و اعلیٰ مستفیض
ماه و ماهی نور و ظلمت دین و دنیا مستفیض
از لبِ ساحل شنید این شور هر جا مستفیض
از عطا و دستِ فیّاض تو دریا مستفیض
وز ریاضِ نکهتِ طبع تو رضوان خوشه چین
ای زِحلم و خاکساری کوه و صحرا مستفیض
از شجاعت دین و از عدلِ تو دنیا مستفیض
از جبین مهرِ مبین وز لب مسیحاً مستفیض
از عطا و دستِ فیّاض تو دریا مستفیض
وز ریاضِ نکهتِ طبع تو رضوان خوشه چین [2]

ا۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۶　　۲۔ ایضا

ہفت بند ملا کاشی کے مذکورہ شعر پر مرزا دبیر نے ۳ بند کا اضافہ کیا ہے جو بیت جس انداز کی ہے اسی کے مطابق بند کے اشعار موزوں کیے ہیں۔خصوصاً جن تلمیحات سے استفادہ کیا ہے ان کو مکمل طور پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ جناب خضر علیہ السلام کو خداوند متعال نے زمین پر زندہ رکھا ہے اور آپ راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی راہنمائی فرماتے ہیں۔ چونکہ رسول کریمؐ کی اکثر احادیث سے حضرت علیؑ کی انبیاء پر افضلیت ثابت ہے لہذا اسی مناسبت سے مرزا دبیر نے ذکر کیا ہے کہ حضرت خضرؑ اپنی ابدی زندگی کے ساتھ حضرت علیؑ کی گلی کا طواف کرتے ہیں۔ طواف کی مناسبت سے گلی کو کعبہ سے استعارہ دیا ہے کیونکہ اسلام میں طواف کعبہ ہی کا کیا جاتا ہے۔ خود کعبہ کو بھی علیؑ کی گلی کے اعتکاف پر فخر ہے۔ چونکہ سید الملائکہ جبرئیل امین حضرت علیؑ کو اپنا استاد مانتے ہیں لہذا ملائکہ بھی اپنے پروں سے سایہ کرتے ہوئے ہمراہ رہتے ہیں، دربار میں حضرت موسیؑ صاحب دیوان جیسے ہیں یہاں حضرت موسیٰ کا نام ان کے مشہور معجزہ جو دریا میں پانی کے درمیان ۱۲ راستے بنانے کا ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی بطور تلمیح بیان کیا گیا ہے۔

خضر و با عُمرِ اَبَدْ در کعبۂ کُویت طواف
کعبه را در قبلۂ کویِ تو فَخرِ اعتکاف
چتر بردارِ تو از شهپر ملایک در مصاف
صاحبِ دیوان اَمرت موسیٰؑ دریا شگاف
پرده دارِ بامِ قصرت عیسیٰؑ گردوں نشین [1]

تصوف کے مشہور و معروف چار سلسلوں میں سے تین سلسلے، سلسلہ چشتیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ نقشبندیہ حضرت علیؑ تک ہی پہنچتے ہیں۔ دنیا کا سب سے پہلا ملفوظ آپ کے خطبات اور ارشادات کو ہی سمجھا جانا چاہیے۔ حضرت علیؑ کو ہی ہر ولی اپنا ولی قرار دیتا ہے۔ نہج البلاغہ شارح ابن الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے:

"دیگر از علوم، علم طریقت و حقیقت و احوال

۱۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص۶

تصوف است، و دانستی که ارباب این فن در جمیع
بلاد اسلام به وی می رسند و نزد وی پایگاه دارند و
به این مطلب شبلی و جنید و سرّی و ابو یزید
بسطامی و ابو محفوظ معروف کرخی و دیگران
تصریح کرده اند و خرقه ای تا امروز شعار آنان
بوده دلیل کافی برای تو است چرا که آن را به وی
(حضرت علی) علیه السلام اسناد می دهند''۔[1]

دوسرے شارح نہج البلاغہ ابن میثم بحرانی رقمطراز ہیں:

''و اما علمای صوفیه و ارباب عرفان، نسبتشان به وی
(علیؑ) در تصفیه باطن و کیفیت سلوک الی الله تعالی
ظاهر است''۔[2]

مرزا دبیر نے اسی مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ ہر ولی آپ کی خدمت میں حاضر رہتا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ بھی مشتاق ملاقات رہتے ہیں۔ ہر نبیؑ آپ سے محبت کرتا ہے۔ بوعلی شاہ قلندرؒ کے یہ اشعار بہت معروف ہیں:

از می عشق شاه سر مستم
بنده مرتضی علی هستم
من بغیر از علی ندانستم
علی ولی الله از ازل گفتم
حیدریم قلندرم مستم
بنده مرتضی علی هستم
پیشوای تمام رندانم
که سگ کوی شیر یزدانم[3]

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ابن الحدید، ج۱، ص۱۹ ۲۔ شرح نہج البلاغہ، کمال الدین میثم بحرانی، جزء۱، ص۷۹
۳۔ دیوان بوعلی قلندر مع مثنوی، ص۱۶۹

امام شافعیؒ کے یہ اشعار بھی بہت مشہور ہیں:

علی حبه جنه امام الانس والجنه
وصی المصطفی حقا قسیم النار والجنه [1]

اب مرزا دبیرؔ کا موزوں کیا ہوا بند ملاحظہ فرمائیں:

خضر رادر کعبۂ کویِ تو فخرِ اعتکاف
از بهشت آید خلیلُ الله مشتاقِ طوا ف
هر نبیؑ و هرولی در خدمتت بی اختلاف
صاحبِ دیوان ِ اَمرت موسیؑ دریا شگاف
پرده دارِ بامِ قصرت عیسیؑ گردون نشین[2]

حضرت علی کا ایک مشہور لقب مشکل کشا ہے یعنی آپ مخلوق خداوندی کی مشکلیں حل فرماتے ہیں۔ آپ نے مردوں کو بھی زندہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ مجلسی ''بحار الانوار'' میں یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''امام صادقؑ فرمود: فلانی و فلانی وعبد الرحمن بن عوف آمدند تا پیامبرؐ را اذیت کنند.اولی گفت: خدا ابراهیمؑ را خلیل و دوست قرار داد با تو چه کار کرد؟دومی گفت: خدا موسیؑ را کلیم قرار دادبا تو چه کار کرد؟عبد الرحمن بن عوف گفت:عیسیؑ بن مریمؑ مرده را باذن خدا زنده می کردتو چه کار می توانی انجام دهی؟! حضرتؐ به اولی گفت: خدا ابراهیمؑ را خلیل خود قرار داد و مرا حبیب خود.به دومی گفت: خدا با موسی از پشت پرده سخن می گفت و من عرش خدا را دیدم و به او سخن گفتم. به سومی گفت:

۱۔ دیوان شافعی، ص ۳۲ ۲۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۹، مطبع یوسفی، دہلی

عیسیٰ مرده را به اذن خدا زنده می کرد و اگر بخواهید من مردگان شما را زنده کنم. گفتند: آری می خواهیم. و به این خاطر هم در آنجا جمع شده بودند. پیامبرؐ علیؑ را طلب کرد و به او فرمود: اینها را قبرستان ببر. سپس به آنها گفت: به دنبال علیؑ بروید. وقتی به وسط قبرستان رسیدند، حضرت سخنانی گفت که زمین لرزید و دگرگون شد. قلبهای آنها را وحشت گرفت. ترسیدند و نتوانستند آن را تحمل کنند ، گفتند: یاعلیؑ ! خدارا از تقصیرات تو بگذرد از تقصیر ما بگذر. علیؑ مردگان را سلام کرد و مردگان جواب دادند"۔[1]

ترجمہ: امام صادق نے فرمایا کہ فلاں و فلاں اور عبد الرحمٰن بن عوف آئے تاکہ رسول اکرمؐ کو اذیت دیں۔ پہلے نے کہا: خدا نے ابراہیمؑ کو خلیل و دوست قرار دیا تمہارے ساتھ کیا کیا؟ دوسرے نے کہا: خدا نے موسیٰؑ کو کلیم قرار دیا تمہاری ساتھ کیا کیا؟ عبد الرحمٰن بن عوف نے کہا: عیسیٰؑ ابن مریم خدا کے اذن سے مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے تم کیا کر سکتے ہو؟ آنحضرت نے پہلے سے کہا: خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل قرار دیا اور مجھے اپنا حبیب کہا۔ دوسرے سے کہا: خدا موسیٰؑ سے پس پردہ بات کیا کرتا تھا اور میں نے عرش پر خدا کو دیکھا اور اس سے بات کی۔ پھر تیسرے سے کہا: عیسیٰؑ مردے کو خدا کے اذن سے زندہ کیا کرتے تھے اور اگر تم چاہو تو میں تمہارے مردوں کو زندہ کردوں۔ انہوں کہا: ہاں ہم چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کو بلایا اور ان سے فرمایا: ان کو قبرستان لے جاؤ۔ پھر اس کے بعد ان سے کہا: علیؑ کے پیچھے جاؤ۔ جب قبرستان کے درمیان میں پہنچے۔ حضرت نے کچھ کہا کہ زمین لرزی اور اس کی حالت بدل گئی۔ ان کے دلوں میں وحشت طاری ہوئی وہ ڈرے اور اس

۱۔ بحار الانوار، علامہ مجلسی، ج۴۱ص۱۹۴

کو برداشت نہ کر پائے۔ کہا: خدا کے واسطے ہماری سے درگذر کرو۔ علیؑ نے مردوں کو سلام کیا اور مردوں نے علیؑ کے سلام کا جواب دیا۔

مناقب اہل بیت میں بھی ایک اسی طرح کا واقعہ نقل ہوا ہے:

"امام صادقؑ فرمودند: قومی از بنی مخزوم بودندکه با علیؑ (از طرف مادری) نسبت قوم و خویشی داشتند.روزی جوانی از آنها خدمت امیر المومنینؑ آمد و گفت:ای دایی، یکی از نزدیکانم فوت کرده ومن خیلی اندوهگین شده ام. حضرتؑ فرمود: آیا دوست داری او را ببینی؟گفت: بله. حضرتؑ فرمود: مرا بر سر قبراو ببر.سپس امامؑ دعا کرد و فرمود : ای فلانی به اذن خدای تعالی بپاخیز.دراین هنگام میت بر بالای قبر نششت.در حالی که می گفت:و نیه، ویه، شالا یعنی لبیک لبیک ای آقای ما.امیر المومنینؑ گفت: این چه زبانی ست؟ آیا تو از دنیا نرفتی که یک فرد عرب(زبان) بودی؟گفت: بلی ولی من در حالی که بر ولایت دیگری بودم از دنیا رفتم و زبانم به زبان اهل آتش مبدل گشت".[۱]

ترجمہ: امام صادقؑ نے فرمایا: بنی مخزوم میں ایک قوم (جو حضرت علیؑ سے ماں کی جانب سے نسبت رکھتے تھے)۔ ان میں سے ایک روز ایک جوان حضرت علیؑ کی خدمت میں آیا اور کہا: اے ماموں میرا ایک قریبی فوت ہو گیا ہے اور میں بہت زیادہ غمگین ہوں۔ حضرتؑ نے فرمایا: کیا اس کو دیکھنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں، حضرتؑ نے فرمایا: مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ اس کے بعد امام نے دعا کی اور فرمایا: اے فلاں خدا کے حکم سے اٹھ جا۔ اسی وقت مردہ اٹھ کر قبر کے اوپر بیٹھ گیا۔ اس صورت میں کہ

۱۔ مناقب اہل بیت، ص ۶۸

وہ کہہ رہا تھا: نیہ، یہ، شالا یعنی اے ہمارے آقا لبیک لبیک۔ امیر المومنینؑ نے کہا: یہ کون سی زبان ہے؟ کیا تو جب دنیا سے گیا عرب نہیں تھا؟ کہا: ہاں لیکن میں کسی دوسرے کی ولایت میں اس دنیا سے گیا اور میری زبان اہل جہنم سے بدل گئی۔

حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب اکثر شعراے عرب و عجم رطب السان ہیں۔ مثلاً دعبل خزاعی، سنائی غزنوی، خواجہ فرید الدین عطار، مولانا رومی، سعدی شیرازی، شاہ نعمت اللہ ولی، بوعلی شاہ قلندر، مرزا غالب اور علامہ اقبال وغیرہ نے مدح حضرت علیؑ میں طبع آزمائی کی ہے۔

دعبل فی خصائص الامام علیؑ

الا انه طهر زكی مطهر
سريع الى خيرات والبركات
غلاما و كهلا، خير كهل ويافع
و ابسطهم كفاً الى الكربات
و اشجعهم قلبا، واصدقهم اخا
و اعظهم فی المجد و القربات
اخو المصطفی، بل صهره و وصيه
من القوم ، والستار للعورات
لهارون من موسى على رغم معشر
سفالٍ لئامٍ شُقَّقِ البشرات
فقال: الامن كنت مولاه منكم
فهذا له مولی بعيد وفاتی
أخي، ووصيي، وابن عمی،ووارثی
وقاضی ديونی من جميع عداتی

سنائی غزنوی مدح علی میں رطب اللسان ہیں:

ای سنائی بی کله شوگرت باید سروری
ز انکه نزد بخردان تا با کلاهی بیسری
چون تو 'لا' را کهتری کردی پس از دیوان امر
جز تو ز 'الا الله' که خواهد یافت امر مهتری
چون در خیبر بجز حیدر نکند از بهر آن
خانه دین را که داند کرد جز حیدر دری [1]

خواجہ فریدالدین عطار حضرت علیؑ کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صدری که بود از پس و حلوا ز پس بود
آن صدر صدر هر دو جهانست مرتضیٰ
شیر خدا و ابن عم خواجه آنکه یافت
تختی چو دوش خواجه و تاجی چو هل اتیٰ
این هفت حلقه پس که دری جست تا بیافت
وان در در مدینه علمست مجتبیٰ [2]

مولانا جلال الدین رومی نے جنگ خندق میں حضرت علیؑ کے عمر عبدود کے سینے سے اتر آنے کے واقعہ کو مثنوی معنوی کے دفتر اول میں نظم کیا ہے:

از علی آموز اخلاص عمل
شیر حق را دان مطهر از دغل
در غزا بر پهلوانی دست یافت
زود شمشیری بر آورد و شتافت

ا۔ فارسی قصیدہ نگاری، ص۳۱ ۲۔ دیوان عطار نیشاپوری، ص۷۰۵

او خدو انداخت در روی علیؑ
افتخار هر نبی و هر ولی
آن خدو زد بر رخی که روی ماه
سجده آرد پیش او در سجده گاه
درزمان انداخت شمشیر آن علی
کرد او اندر غزا اش کاهلی
گشت حیران آن مبارز زین عمل
وز نمودن عفو و رحمت بی محل
گفت بر من تیغ تیز افراشتی
از چه افکندی مرا بگذاشتی
آن چه دیدی بهتر از پیکار من
تا شدی تو سست در اشکار من

سعدی شیرازی کہتے ہیں:

کس را چه زور و زهره که وصف علی کند؟
جبار در مناقب او گفته: هل اتی
زورآزمای قلعه خیبر که بند او
در یکدگر شکست به بازوی لافتی
مردی که در مصاف زره پیش بسته بود
تا پیش دشمنان ندهد پشت بر غزا
شیر خدای و صفدر میدان و بحر جود
جا بخش در نماز و جهانسوز در وغا

دیباچه مروت و سلطان معرفت
لشکر کش فتوّت و سردار اتقیا
فردا که هر کسی بشفیعی زنند دست
ماییم و دست و دامن معصوم مرتضیٰ [1]

مرزا غالب حضرت علیؑ کی منقبت یوں بیان کرتے ہیں:

فرمان سرفرازی مشت غبار خویش
از شهسوار دوش پیمبرؐ بر آورم
یارب ز یا علیؑ نشناسم قلندرم
یک می ز آبگینه و ساغر بر آورم
در دل بجستجو همه ایزد در آورم
وز لب به گفتگو همه حیدرؑ بر آورم
هر شکوه کز فلک بدلست از ره زبان
در بارگاه قاتل عنتر برآورم
گویم علیؑ ست آنکه ز فرد عطای او
جویم اقل و یک قلم اکثر برآورم [2]

علامہ اقبال حضرت علیؑ کی شان میں فرماتے ہیں:

مسلم اول شه مردان علیؑ
عشق را سرمایه ایمان علیؑ
از ولای دودمانش زنده ام
در جهان مثل گهر تابنده ام

۱۔ کلیات سعدی، ۶۰۴ ۲۔ غالب دیوان نعت و منقبت، ص ۴۰۷/۴۰۸

نرگسم وارفته نظاره ام
در خیابانش چو بو آواره ام
از رخ او فال پیغمبر گرفت
ملت حق از شکوهش فر گرفت
قوت دین مبین فرموده اش
کائنات آئین پذیر از دوده اش
مرسل حق کرد نامش بوتراب
حق ید الله خواند در ام الکتاب
هر که دانای رموز زندگیست
سر اسمای علیؑ داند که چیست [1]

مرزا دبیر نے اپنے پیشروں کا اتباع کرتے ہوئے مذکورہ مضامین کو اتنی بلندی عطا کی کہ بعد کے فارسی شعرا اسی میدان میں ان کا اتباع کرتے نظر آ رہے ہیں:

مثلِ سلمانؑ در بلاها میکنی امدادِخلق
چون نُصیری زنده می سازی دلِ ناشادِ خلق
هست در مدحِ تو این بیتِ بلند اورادِخلق
صورتِ معنیِ فطرت باعثِ ایجادِ خلق
بهترینِ نسلِ آدم نفسِ خیرُ المرسلینؐ
نوبتِ سُلطانیت شورِ مُبارکبادِ خلق
چشمِ توبرحالِ خلق و گوش بر فریادِ خلق
میکند توصیفِ توخالق دمِ امدادِ خلق
صورتِ معنیِ فطرت باعثِ ایجادِ خلق
بهترینِ نسلِ آدم نفسِ خیرُ المرسلین

ا۔ اسرار خودی، کلیات اقبال، ص ۳۳

ذاتِ والایِ تو بیشک موجبِ بنیادِ خلق
دادِعدل و دادِ خالق داد از امدادِ خلق
مدحِ تو باهم کنند ارواحِ خلق اجسادِ خلق
صورتِ معنیِ فطرت باعثِ ایجادِ خلق
بهترینِ نسلِ آدم نفسِ خیرُ المرسلینؐ [1]

اس بیت کی خاص بات یہ ہے کہ مرزا دبیر نے حضرت علیؑ کو اولادِ آدم میں سب سے بہتر قرار دیا ہے لیکن اس کی وجہ بیان ''نفس خیر المرسلین'' بیان کر کے معترضین سے اعتراض کا موقع چھین لیا۔

طینتِ پاک تِو اصلِ مایه اجسادِ خلق
در خمیرت چون نمک خواری و امدادِخلق
در ثنایت می نگارد با نبیؐ بنیادِ خلق
صورتِ معنیِ فطرت باعثِ ایجادِ خلق
بهترینِ نسلِ آدم نفسِ خیرُ المرسلینؐ [2]

حضرت علیؑ کا ایک لقب حلال مشکلات ہے نبی کریم کی خدمت و نصرت مولا علیؑ کا اولین فریضہ تھا۔ رحمۃ للعالمین نے رحمٰن و رحیم سے اپنی یاور و نصرت کے لیے حضرت علیؑ کو مانگا تھا۔ قرآن کریم نے رسول کی اس دعا کا ذکر کیا ہے:

"وقل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعلنی من لدنک سلطاناً نصیراً". اور یوں کہیے: پروردگارا! تو مجھے (ہر مرحلہ میں) سچائی کے ساتھ داخل کر اور سچائی کے ساتھ (اس سے) نکال اور اپنے ہاں سے مجھے ایک قوت عطا فرما جو مددگار ثابت ہو۔ [3]

رسول کریمؐ نے خدا سے دعا کی اور آپ کو علی جیسا ناصر عطا ہوا جس نے اپنی پوری زندگی

۱۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۱۲ ۲۔ ایضاً، ص ۱۳ ۳۔ سورہ اسراء، آیت ۸۰

نصرت نبی میں گذار دی۔ بلکہ ابتدائے تبلیغ دین سے رسولؐ کی آخری سانس تک ہمیشہ شانہ بشانہ رہے اور حق نمک خواری ادا کیا اسی کو مرزا دبیر نے نظم کیا ہے کہ حضرت علی کے خمیر میں نمک خواری اور اس کا حق ادا کرنے کی توفیق شامل تھی۔ اسی لئے نبی نے بارہا حضرت علیؑ کی فضیلت بیان فرمائی۔ اور اپنا جز قرار دیا۔

"عن مقسم عن ابن عباس قال: قال النبیؐ لعلیؑ:یا علیؑ انت منی و انا منک، و انت اخی و صاحبی". ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت علیؑ کے فرمایا: اے علیؑ! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں تم میرے بھائی اور دوست ہو۔ [1]

ختم در مشقِ عبادت ساختی قُرآن عمر
عاقبت در سجده آخرشد سروسامانِ عمر
یاعلیؑ بشنو چه گویدحاسبِ دیوانِ عمر
ناشنیده از زبانِ مهد تاپایانِ عمر
بی رِضایٔ حق ز تو حرفی کراماً کاتبین [2]

حضرت علیؑ کی ساری زندگی عبادت الٰہی میں بسر ہوئی اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہو گی کہ ولادت خانہ خدا کعبہ میں ہوئی اور شہادت محراب عبادت سجدہ الٰہی میں یعنی آنکھ کھولی تو خدا کے گھر میں آنکھیں بند کیں تو خدا کے گھر میں علی کی زندگی خدا کے گھر سے شروع ہوئی اور خدا کے گھر میں تمام ہوئی۔ اسی لئے سر پہ ضربت لگنے کے بعد کہا گیا تھا "فزت برب الکعبه"، رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ مرزا دبیر نے مذکورہ بند میں یہی مفاہیم نظم کئے ہیں کہ آپ کی پوری زندگی رضائے الٰہی میں گزری یہاں تک کہ کرام الکاتبین نے آغوش مادر سے آغوش قبر تک کوئی ایسا کلمہ نہیں سنا جو خدا کی ناراضگی کا موجب ہو۔

۱۔ تذکرہ امیر المومنین علی ابن ابیطالب فی تاریخ دمشق، ص۲۲ ۲۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص۱۳

ممتنع در عالمِ واقع شریکِ ذوالجلال
رحمة للعالمین و تو چو واجب بی مثال
نیست بی مثلی مگر بر اتحاد هر سه دال
مثل تو چون شبهه ایزد در همه حال ومحال
ور بود ممکن نه الّا رحمة للعالمین
فهم و وهم و عقل وفکروذهن وادراک وخیال
درتلاشِ مثل تو سر گشته و هم پا یمال
بالیقین دانم ترا مانند واجب بی مثال
مثل تو چون شبه ایزد در همه حال و محال
ور بود ممکن نه الاّ رحمة للعالمین [1]

اللہ نے اپنے حبیب، محمد مصطفیٰؐ کو اپنے نور سے خلق کیا اور یہ نور صلب آدمؑ سے ہوتا ہوا صلب عبدالمطلب تک پہنچ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ایک حصہ عبداللہ کے صلب میں اور دوسرا ابو طالب کے صلب میں پہنچا۔ مذکورہ بند میں مرزا دبیر نے الہیات و توحید کی بحث چھیڑی ہے توحید کا مطلب ہے کہ خدا واحد و یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ خدا واجب الوجود ہے اور باقی کائنات ممکن الوجود۔ مرزا دبیر نے ذات علیؑ کی نظیر کی بات کی ہے کہ سوائے محبوب الٰہی کوئی نفس علیؑ سے برتر نہیں ہے۔ عقل، ذہن، فکر، خیال، وہم، گمان سب تھک کر چور ہو جائیں گے لیکن علیؑ کی نظیر نہ پائیں گے۔ علی ہی وہ ذات ہے جو سوائے رسول الثقلین کی نظیر ہے۔

چون دبیّر خسته هند ز تو دور ای دین پناه
گوش بر آواز لبیک تو بر لب شور آه
چشم تر بر راه و از تقصیر خدمت و عذر خواه
بندۂ بیچاره کاشّی از دل و جان سال و ماه
روز وشب در خطه اهل ثنا خوان شما ست [2]

---

[1] شمس المشرقین، مرزا دبیر، ص ۱۶ [2] مصحف فارسی، ص ۱۵۴

مرزا دبیرؔ نے جس بند کو بطور مقطع نظم کیا ہے اس میں اپنے تخلص کے ساتھ ساتھ ملا حسن کاشی کا تخلص کاشیؔ بھی استعمال کیا ہے یعنی ملا حسن کاشی کے مقطع کو اپنے مقطع کے بند کی بیت قرار دیا ہے اور حسن کاشی کی طرح آرزوے زیارت ظاہر کی ہے۔

غرض کہ اس تضمین میں" **اول ما خلق الله نوری**"و" **انا و علی من نور واحد**"اور اس کے علاوہ دیگر احادیث رسول کی تشریح نہایت خوبصورت انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ جس میں قرآن کی"**وما ارسلنک الا رحمة للعالمین**"، "**ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مّذکوراً**"، **مرج البحرین یلتقیان**" جیسی متعدد آیات کو جزو مضمون بنا کر قرآنی تلمیح اور فارسی و عربی زبان کا امتزاج خاصی سیر مندی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ جسے اسلوب دبیرؔ کا افتخار کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

۱۔قرآن کریم
۲۔آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، کیمبرج پریس لاہور، اگست ۱۹۷۰ء
۳۔آثار الصادقین، ج۱۱، ص ۱۵۵
۴۔اردو مرثیے کا ارتقاء، ڈاکٹر مسیح الزماں، ابتدا سے انیس تک، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو۔
۵۔ارجح المطالب، مولانا عبید اللہ بسمل امرتسری، بہاول پریس، لاہور، ۱۸۹۹ء
۶۔اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی
۷۔اسرار خودی، کلیات اقبال، غلام علی پرنٹرز اشرفیہ پارک فیروز پور لاہور ۵۴۰۰۰
۸۔اشارہ نوحہ نمبر ص ۴۷، والفجر آرگنائزیشن، ہندوستان، دسمبر ۲۰۱۱ء/محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
۹۔اصلاح محرم نمبر ۱۴۳۵ھ نومبر، دسمبر ۲۰۱۳ء، ادارہ اصلاح، مسجد تحسین علی خاں، لکھنو،
۱۰۔الادب المفرد الجامع للآداب النبوہ، حافظ ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری، دار الصدیق، الجبیل، المملکۃ العربیۃ السعودیہ ۱۴۲۱ھ
۱۱۔الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ابن حجر عسقلانی، مکتبہ رحمانیہ لاہور
۱۲۔الامالی، شیخ طوسی، ص ۶۷۷، مجلس ۳۷ ح ۱۰
۱۳۔الجامع لاحکام القرآن، اسم المؤلف: ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، دار النشر: دار الشعب، القاہرۃ، ج ۱۹
۱۴۔الحدائق الوَردِیَّہ، حمید بن احمد مُحَلّٰی، ج ۱، ص ۳۱۲
۱۵۔الدر المنثور فی التفسیر الماثور، جلال الدین سیوطی، مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیہ والاسلامیہ، قاہرہ ۲۰۰۳ء
۱۶۔الکافی، الشیخ کلینی، ۶/۵۳۸/۴، دار الکتب اسلامیہ، تہران
۱۷۔المعجم الکبیر، ج ۳، ص ۳۳
۱۸۔المعجم فی معاییر اشعار العجم، شمس قیس رازی، کتاب فروشی تہران، تبریز بازار شیشہ گر خانہ

۱۹۔المستدرک علی الصحیحین ، ج۳ص۱۹۴
۲۰۔اَلملھوف علیٰ قتلی الطّفوف ،ص۱۷۱، سید ابن طاؤس حلی
۲۱۔الواعظ محرم نمبرص ۳۸، مئی ۱۹۶۱ء
۲۲۔انتخاب از مراثی انیس، پبلشرز رام نرائن لال بنی مادھو۲ کٹرہ روڈ الہ آباد ۱۹۶۲ء
۲۳۔انتخاب منیر شکوہ آبادی، مرتبہ ریاض الدین، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۲ء
۲۴۔انواع شعر فارسی، ڈاکٹر منصور رستگار فسای، انتشارات نوید شیراز
۲۵۔بحار الانوار، علامہ مجلسی، ج۴۱ص۱۹۴
۲۶۔بحر الفصاحت، مولوی نجم الغنی رامپوری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، مارچ ۲۰۰۶
۲۷۔بحور الغمہ ، حضرت علامہ محمد علی لکھنوی، مرتبہ علامہ سخاوت حسین سندرالوی، حسن پبلی کیشنز، ۳۸ غزنی اسٹریٹ، اردو بازار لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء
۲۸۔ پیام عمل دبیر نمبر ۱۹۷۷ء
۲۹۔ تاریخ الامم والملوک، طبری، ج۵، ص۱۳۵۴
۳۰۔تاریخ الرسل والملوک، محمد بن جریر طبری، ج۳، ص۱۰۲۷، انتشارات اساطیر، تہران، ۱۳۶۲
۳۱۔تاریخ مرثیہ (ابتدائی دور: ایران میں عزاداری اور فارسی مرثیہ) پروفیسر مسعود حسن رضوی، محبان ام الائمہ علیہم السلام تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ باتعاون ولایت فاؤنڈیشن دہلی، ستمبر ۲۰۱۵ء
۳۲۔ترجمہ الحسین ومقتلہ، فصلنامہ تراثنا، شمارہ ۱۰، ص۱۸۴
۳۳۔ترمذی، محمد بن عیسی، بیروت، دار الفکر، ج ۱۲
۳۴۔تذکرہ امیر المومنین علی ابن ابیطالب فی تاریخ دمشق، ابن عساکر، ص۲۲، مرتب خسرو قاسم، مشکوۃ پرنٹرس، علی گڑھ۔۲۰۱۵ء
۳۵۔تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء ، ص/۲۹۵
۳۶۔تذکرۃ العلماء، سید مہدی فیض آبادی، ص۵۰
۳۷۔تلاش دبیر، کاظم علی خاں، ص۸۴، نامی پریس، ۱۰۲/وکٹوریا اسٹریٹ، لکھنو۔دسمبر ۱۹۷۹ء
۳۸۔تفسیر بیضاوی جلد اول ص ۱۱۸
۳۹۔تفسیر درمنثور

۴۰۔ جامع الصغیر سیوطی جلد اص ۴۷۴ ۳
۴۱۔ چودہ ستارے، مولانا نجم الحسن کراروی، ص ۲۰۱، عباس بک ایجنسی، رستم نگر، درگاہ حضرت عباس، لکھنو
۴۲۔ حیات دبیر، افضل حسین ثابت لکھنوی، جلد ا باب اول ص ۴۔ سیوک اسٹیم پریس لاہور۔ ۱۹۱۳ء
۴۳۔ خمسہ نظامی، حکیم نظام الدین الیاس نظامی گنجوی، ہرمش پبلیشرز، خیابان ولی عصر، بالاتر از میدان ونک، تہران، چاپ سوم ۱۳۹۰، ISBN: 978-964-363-413-1
۴۴۔ دبیر اور شمس آباد، محمد صادق صفوی، ص ۲۳ سرفراز قومی پریس لکھنو ۱۹۹۸ء
۴۵۔ دبستان دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، ص ۳۰۲ مطبع نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ لکھنو ۱۹۶۶ء
۴۶۔ دستور الفصاحت، احمد علی خان یکتا لکھنوی، رامپور رضا لائبریری رامپور، ۱۹۴۳ء
۴۷۔ دعائم الاسلام، قاضی نعمان مغربی، ج ۲، ص ۱۵۴
۴۸۔ معراج الکلام، مرزا اوج لکھنوی، مرتبہ خبیر لکھنوی، ص ۹، نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنو
۴۹۔ دیوان آغا حجو شرف، ص ۳۶۳، مطبع جعفری لکھنو
۵۰۔ دیوان بوعلی شاہ قلندر، کتابی دنیا دہلی، ترکمان گیٹ دہلی ۶، ۲۰۰۵، ISBN:81-87666-94-3
۵۱۔ دیوان بوعلی قلندر مع مثنوی، محمد صدیق خاں شبلی، ص ۱۶۹، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۵
۵۲۔ دیوان حافظ، بہ کوشش استاد ناہید فرشاد مہر، انتشارات گنجینہ، تہران، خیابان ناصر خسرو، بازارچہ کتاب، ISBN: 978-964-6152-93-9
۵۳۔ دیوان حافظ، بہ تصحیح دکتر اکبر بہروز، موسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران چاپ دوم ۱۳۶۳
۵۴۔ دیوان حسن کاشی، ص ۸/۷
۵۵۔ دیوان دعبل خزاعی، دار الکتاب العربی، بیروت، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۴ء
۵۶۔ دیوان شمس تبریز، مولانا جلال الدین رومی، مقدمہ بامداد جایباری، چاپ اول انتشارات گلشایی، خیابان انقلاب، چہار راہ ولی عصر بلاک ۲۷۰، بھار ۱۳۶۸
۵۷۔ دیوان ناصر خسرو، موسسہ انتشارات، تہران
۵۸۔ دیوان اوحدی مراغہ ای، موسسہ انتشارات، تہران
۵۹۔ دیوان اشعار محمد تقی ملک الشعراء بہار مشہدی، چاپ اول ۱۳۷۸، چاپخانہ حیدری، تہران، نشر سمیر، ISBN: 964-6552-81-1

۶۰۔ دیوان عطار نیشاپوری، مصحح: تقی تفضلی، مرکز انتشارات علمی و فرہنگی وابستہ بہ وزارت فرہنگ و آموزش عالی، چاپخانہ سکہ، چاپ سوم ۱۳۶۲
۶۱۔ دیوان محتشم کاشانی، ترکیب بند نمبر ۶، مرکز تحقیقات رایانہ ای قائمیہ اصفہان
۶۲۔ دیوان ناسخ، جلد دوم، مطبو نامی منشی نولکشور، ۱۸۸۶ء
۶۳۔ ذاخر لکھنوی حیات اور شاعری، سید رضا کاظم تقوی ص ۱۶۱ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنو، مارچ ۲۰۱۲
۶۴۔ رباعیات دبیر، مدون ڈاکٹر سید تقی عابدی، شاہد پبلیکیشنز، ۲۲۵۳، ریشم اسٹریٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲، ۲۰۰۸ء
۶۵۔ سفینۃ البحار، ج ۲ ص ۳۴۷، شیخ عباس قمی، دار الاسوہ، قم
۶۶۔ سنن ابن ماجہ، حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی، مکتبہ العلم اردو بازار لاہور
۶۷۔ سنن ابی داود، ابی داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی، ج ۱، ص ۱۱۰
۶۸۔ سنن ترمذی، امام ترمذی، مکتبہ بیت الاسلام، لاہور
۶۹۔ شاہنامہ فردوسی طوسی، سلسلہ انتشارات نشر قطرہ، ISBN:964-5958-17-2
۷۰۔ شرح الاخبار، قاضی نعمان مغربی، ج ۳، ص ۴۶۱
۷۱۔ شرح دیوان غالب، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۲۳، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۵۶۱ گلی کوتانہ، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۹۹۲ء
۷۲۔ شرح مذاہب اہل السنہ، ابن شاہین (۳۸۵ ق)، احمد بن عثمان، ج ۱، ص ۱۰۴، مصر، مؤسسہ قرطبہ، ۱۴۱۵
۷۳۔ شرح نہج البلاغہ، ابن الحدید، ج ۱
۷۴۔ شرح نہج البلاغہ، کمال الدین میثم بحرانی، جزء اول، دفتر نشر کتاب، تہران ۱۳۷۹ قمری
۷۵۔ شمس الضحیٰ، میر صفدر حسین۔ مطبع اثنا عشری، لکھنو
۷۶۔ شمس المشرقین، مرزا دبیر، مطبع یوسفی، دہلی
۷۷۔ شواہد التنزیل لقواعد التفضیل، تالیف: الحافظ الکبیر عبید اللہ بن احمد المعروف بالحاکم الحسکانی، تحقیق و تعلیق: الشیخ محمد باقر المحمود، ج ۲
۷۸۔ صحیح بخاری، ج ۱
۷۹۔ صحیح مسلم، ج ۲

۸۰۔ غالب دیوان نعت ومنقبت، مدون: ڈاکٹر سید تقی عابدی، شاہد پبلیکیشنز ۲۲۵۳ کوچہ چیلان دریا گنج دہلی۔ ISBN: 81-903966-2-5
۸۱۔ فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت، پروفیسر عراق رضا زیدی، ادارہ بوستان قلم، سیتھل بریلی، یوپی
۸۲۔ فارسی قصیدہ نگاری، پروفیسر نذیر احمد، ناشر: ادارہ علوم اسلامیہ، اے۔ایم۔یو۔علیگڑھ ۱۹۹۱ء
۸۳۔ فتح الباری، احمد بن علی بن حجر عسقلانی، ج ا
۸۴۔ فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر، اسم المؤلف: محمد بن علی بن محمد الشوکانی، دار النشر: دار الفکر- بیروت، ج ۵
۸۵۔ فرہنگ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، مطبع رفاہ عام، لاہور ۱۹۰۸۔ ISBN:9693507134
۸۶۔ فسانۂ عجائب، مرزا رجب علی بیگ سرور، مطبع منشی تیج کمار لکھنو۔ ۱۹۶۴
۸۷۔ فکر بلیغ، شاد عظیم آبادی، مرتب نقی احمد ارشاد، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنو ۱۹۷۴
۸۸۔ فنون بلاغت وصناعت ادبی، جلال الدین ہمایی، مشخصات نشر تہران: اہورا۔ ۱۳۸۹
۸۹۔ فیروز اللغات فارسی ح ۲، الحاج مولوی فیروز الدین۔ کراچی
۹۰۔ کاشف الحقائق، سید امداد امام اثر، ص ۵۲۹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند، نئی دہلی ۱۹۸۲
۹۱۔ کامل الزیارات، باب ۳۸، روایت ۴
۹۲۔ کتاب نما مرزا دبیر نمبر، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی
۹۳۔ کلیات اشعار فارسی مولانا اقبال، با مقدمہ وشرح احوال بوسیلہ: احمد سروش از انتشارات کتابخانہ سنائی، چاپ ششم ۱۳۷۳
۹۴۔ کلیات انشاء، مطبع منشی نولکشور، لکھنو
۹۵۔ کلیات سعدی شیرازی، تصحیح محمد علی فروغی، انتشارات ہرمس، چاپ ۱۳۸۵
۹۶۔ کلیات شاہ نعمت اللہ ولی، قصیدہ نمبر ۳۱،
۹۷۔ کلیات غزلیات ناسخ، مرتب محمد مقیم، حصہ اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، البلاغ پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ISBN: 978-81-910757-2-4
۹۸۔ کلیات فارسی غالب، ص ۵۰، مطبع منشی نولکشور، لکھنو ۱۹۲۵۔

۹۹۔کلیات واجد علی شاہ، ص ۱۰
۱۰۰۔کلیات میر تقی میر، دیوان دوم، مرتب ڈاکٹر احمد محفوظ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی
۱۰۱۔گذشتہ لکھنو، عبد الحلیم شرر، مکتبہ جامعہ لمٹ
یڈ، نئی دہلی ۱۹۷۱
۱۰۲۔مثیر الاحزان، شیخ ابن نما حلی، مرکز تحقیقات کمپیوتر ی علوم اسلامی
۱۰۳۔مثنویات فانی کا تنقیدی جائزہ، پروفیسر عراق رضا زیدی
۱۰۴۔مخطوطہ نمبر ۵ آدمی سیتھلی، ادارہ بوستان قلم، سیتھل بریلی
۱۰۵۔مخطوطہ یاسر رجیٹوی، ص ۲۵
۱۰۶۔مرزا اوج لکھنوی، ڈاکٹر سید سکندر آغا، ص ۱۳۳، نظامی پریس لکھنو، ۱۹۸۵ء
۱۰۷۔مرزا دبیر کی فارسی نثر، دبیر نمبر، محمد زمان آزردہ، کراچی
۱۰۸۔ مرز اسلامت علی دبیر، محمد زماں آزردہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ISBN: 81-7587-076-1
۱۰۹۔مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب رباب مناقب علی ابن ابی طالب، علامہ شیخ علی بن سلطان محمد قاری متوفی ۱۰۱۴ھ، دار الکتب العلمیہ
۱۱۰۔مستدرک حاکم، ج ۳
۱۱۱۔مصباح الزجاجہ، ج ۱
۱۱۲۔مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۶
۱۱۳۔مصحف فارسی مرزا دبیر، ڈاکٹر سید تقی عابدی، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی ۔۲ ۱۱۰۰۰۔ ۲۰۰۵ء
۱۱۴۔مقتل الحسین خوارزمی، الموفق بن احمد بن محمد المکی الخوارزمی، ج ۲، دار انوار الھدی، قم
۱۱۵۔مقتل ابی مخنف، انتشارات شریف رضی، قم، ایران، ۱۳۱۲م
۱۱۶۔مناقب ابن شہر آشوب
۱۱۷۔مناقب ابن مغازلی
۱۱۸۔واقعات ملا خطا شوستری، نسخہ خطی، لکھنو، سال ۱۳۰۷ ہجری قمری
۱۱۹۔واقعات ملا خطا، نواب محمد تقی علی خان کربلائی، منشی نول کشور مقام لکھنو، حضرت گنج ۱۳۰۷ھ
۱۲۰۔ ینابیع المودہ، ج ۲ باب